February
2021
یوم
یکجہتی
کشمیر

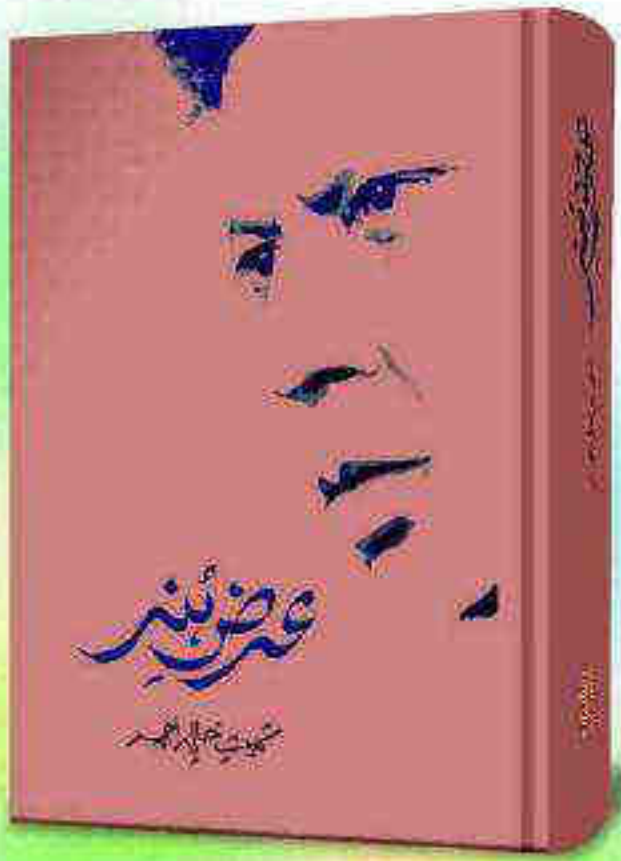

عرضِ ہنر

صفحات: 1232

قیمت: -/800 روپے

فون: +92-42-37513000

بانی مدیر: خالد احمد

ایک پس قدم نظم

ساتھیو! کو بکو جھلملاتے چراغوں کی صف توڑ دو
کور آنکھوں میں جلتے دیوں کی لویں پھوڑ دو
بزدلو! گوشہ گوشہ دمکتے ہوئے قمقموں کی تھرکتی ہوئی
خیرگی خیز عریانیوں کے بدن ایک شب کے
لیے ڈھانپ لو
بادلو! پس قدم ساتھیوں کی طرح ہٹتے بڑھتے رہو
چاندنی سایہ سایہ عمارات پر چھاپہ ماروں کی صورت
اترتی رہے، زرد تخریب کاروں کی صورت
بکھرتی رہے
بادلو! پس قدم ساتھیوں کی طرح چھائے چھائے رہو
ساتھیو! صف بہ صف بادلوں کی طرح سائے سائے رہو
صبح تک کے لیے رات کی دشمنی چھوڑ دو
دوستو! ــــ ساتھیو! ــــ جنگ کی رات
وقت کی بات ہے
رات پھر رات ہے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL | Freight Forwarding | Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ Karachi: (021) 34541301-7 ■ Lahore: (042) 36363300-7
■ Sialkot: (052) 3554301-6 ■ Rawalpindi/Islamabad: (051) 5162704-5
■ Faisalabad: (041) 8542924 ■ Peshawar: (091) 5606565 ■ Multan: (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید فکر و فن کا ترجمان

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 29 - فروری 2021 - شمارہ نمبر: 2

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلسِ ادارت

نجیب احمد	اعجاز رضوی	نعمان منظور	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران - حاذق اسد
کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: یومِ یکجہتی کشمیر
قیمت: 100 روپیہ

سالانہ زرِ اعانت 1000 روپے بیرونِ ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور - 53700
فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517
Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ پر برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر و پرنٹر نے ریکی پرنٹرز سے چھپوا کر 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِی فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	حسن عسکری کاظمی، اکرم ناصر، سرور حسین نقشبندی	7 تا 9
2	نعت	آصف ثاقب، سید ریاض حسین زیدی، محمد لیسین قمر، نسیم سحر، اکرم ناصر، محمد انیس انصاری، خاور اعجاز، شوکت محمود شوکت، عقیل رحمانی، سرور حسین نقشبندی، عامر بن علی، فیروز رضوی، فرح شاہد	10 تا 22
3	عقیدت	عقیل رحمانی، حامد یزدانی	23 تا 24
4	قطعات	خاور اعجاز	25
5	تضمین	شوکت محمود شوکت	26
6	گوشہ خالد احمد	محمد حنیف، خالد احمد، گلزار بخاری	27 تا 46
7	افسانے	بلقیس ریاض، نیلم احمد بشیر، کلیم خارجی، حبیب الرحمن، لبنیٰ مقبول، سیدہ صائمہ کاظمی	47 تا 83
8	مائیکرو فکشن	فرخندہ شمیم	84 تا 85
9	کتب بینی	جمیل احمد عدیل، مظفر اقبال	86 تا 92
10	غزلیں	آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر، غالب عرفان، محمد انیس انصاری، راحت سرحدی، خاور اعجاز، منظور ثاقب	93 تا 165

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
10	غزلیں	ممتاز راشد لاہوری، جاوید شیدا، اکرم ناصر، رشید آفرین علی اصغر عباس، حامد یزدانی، یعقوب پرواز، کبیر اطہر، شبہ طراز احمد جلیل، ایم ارشد ارشد، رضا اللہ حیدر، شفیق احمد خان افروز رضوی، گل بخشالوی، اقبال سروبہ، اشرف نقوی ریاض رومانی، شہزاد احمد شیخ، زبیر فاروق، افتخار شاہد ارشد محمود ارشد، طلعت شبیر، آفتاب خان، ذکی طارق ریاض ندیم نیازی، طاہر ناصر علی، اظہر حسن، حکیم خان حکیم ظہور چوہان، شاداب صدیقی، حسنین سحر، سبطین رضا فیصل زمان چشتی، نعیم رضا بھٹی، عزم الحسنین عزمی آصف شفیع، وسیم عباس، حمزہ ہاشمی سوز، نائلہ راٹھور عاطف جاوید عاطف، شہاب اللہ شہاب، وجاہت تبسم، امجد بابر سرور فرحان، روہانہ روحی، محمد علی ایاز، محسن رضا شافی، اکرم جاذب محمد آفتاب تابش، عمر فیاض قائل، عامر نعمان، اسحاق وردگ ازور شیرازی، عقیل عباس، علی آرش، احمد محمود، شفقت حسین عنبرین خان، گوتم ملتانی، اسرجگی، احمد سجاد بابر، اخلاق اکرم اسعد رضا سحر، محمد دانش رضا، نجیل قیصر	93 تا 165
11	مضامین	حسن عسکری کاظمی، خورشید رضوی، محمد رفیق خان اسلام عظمی، سلمیٰ اعوان، اختر شمار، فصیحہ آصف خان	166 تا 196
12	طنز و مزاح خاکہ	واجدامیر، نور کمال شاہ	197 تا 207
13	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	208 تا 216
14	نظمیں	امجد اسلام امجد، حسن عسکری کاظمی، صفدر صدیق رضی گلزار بخاری، حامد یزدانی، طاہر ناصر علی، شاہنواز زیدی اقبال سروبہ، افشاں سجاد، مظہر حسین اختر، امجد بابر فیصل زمان چشتی، علی حسین عابدی، اعجاز رضوی، نائلہ راٹھور	217 تا 233
15	خطوط	آصف ثاقب، جمیل یوسف، تسنیم سحر، ازہر منیر نور کمال شاہ، رانا محمد شاہد، محمد آفتاب تابش	234 تا 241

حمد

برتر و اعلیٰ ہے تو — دم دم دم دم اللہ ھو
ملجا و ماویٰ ہے تو — دونوں جہاں میں تو ہی تو

ہم تو ہیں بندے ترے — کیا کیا دیکھا آنکھوں نے
آقا و مولا ہے تو — جلوے تیرے، تو ہر سُو

اور کو سجدہ کہاں — جنگل، صحرا تیرے ہیں
لائق سجدہ ہے تو — تیرے دریا تیری جُو

مکہ و بطحا ترا — پنکھ بکھیرے، ناچے مور
مالک کعبہ ہے تو — قمری بولے کُو کُو کُو

دل ہوا ہے مطمئن — تتلی ہے یا پھول کوئی
مدعا ایسا ہے تو — رنگ ہیں تیرے، تیری بُو

تیرا حوالہ بھی — دنیا ساری دھوکا ہے
طور کا جلوہ ہے تو — ڈھے جائیں گے کاخ و کُو

مالک و مختار بھی — باقی جو رہ جائے گا
یا شہِ والا ہے تو — اللہ اللہ اللہ ھو

حسن عسکری کاظمی

حمد

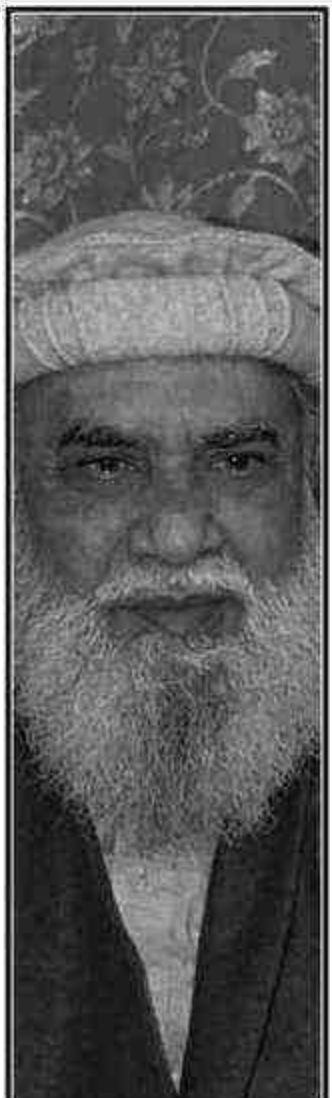

اس کی مرضی ہو تو بات بنا دیتا ہے
اپنے ہاتھ کو میرا ہاتھ بنا دیتا ہے

کبھی چراغ جلاتا کبھی بجھاتا ہے وہ
رات کو دن اور دن کو رات بنا دیتا ہے

کبھی بچا دیتا ہے شہ کو وہ شہ دے کر
کبھی وہ شہ کو ہی شہ مات بنا دیتا ہے

اس دربار میں اک جیسے ہیں شاہ و گدا سب
جس کے چاہے جو حالات بنا دیتا ہے

چاہے تو قطرہ پانی نہیں دے آنکھوں کو
چاہے تو ان کو برسات بنا دیتا ہے

پہلے سوچ سمندر کو لفظوں میں ڈھالے
پھر ان لفظوں سے وہ نعت بنا دیتا ہے

کوئی خدو خال نہ شکل شباہت پھر بھی
وہ ذہنوں میں اپنی ذات بنا دیتا ہے

پھول اور پات گرا دیتا ہے وہ شاخوں سے
پھر شاخوں پہ پھول اور پات بنا دیتا ہے

اکرم ناصر

حمد

رہے نہ فکرِ معاش مولا
اگر ہو تیری تلاش مولا

جو حرف لکھوں بنے نگینہ
میرا تخیل تراش مولا

تو اپنے بندوں میں نام لکھ لے
میں ایسا بن جاؤں کاش مولا

اگر نہ مانوں میں حکم تیرا
تو چلتی پھرتی ہوں لاش مولا

تلاش اس کو کریں زمانے
جسے ہو تیری تلاش مولا

تو اپنی رحمت سے آپ کر دے
ریا کے بت پاش پاش مولا

ترے کرم سے تھما ہوا ہے
زمین کا ارتعاش مولا

دلوں پہ غفلت کے چھید مالک
نفس نفس ہے خراش مولا

بنائی تو نے شہنشوں سی
فقیر کی بود و باش مولا

کہیں بھی سرورؔ کی معصیت کا
کبھی نہ ہو راز فاش مولا

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

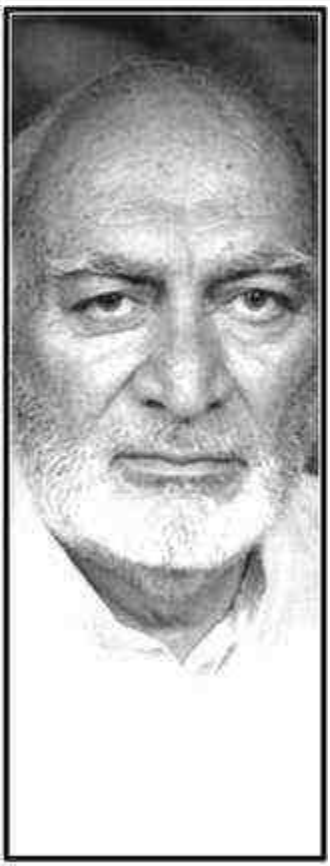

درود و ذکر کا یہ اہتمام کافی ہے
مرے لیے تو محمدؐ کا نام کافی ہے

خدا کی شان بھی "جل جلالہ" ہے بہت
نبیؐ کے نور کا بھی احتشام کافی ہے

میں روزگار کے جھگڑوں میں کیوں پڑوں کہ مجھے
دعا ، درود و عبادت یہ کام کافی ہے

میں ایک لفظ جو حضرتؐ کے عشق میں لکھوں
مری نجات کو اتنا کلام کافی ہے

برائے نام وسیلوں کو کیا کروں ثاقب
مجھے تو رحمتِؐ خیرالانام کافی ہے

آصف ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس طرف دیکھیں پئے اذن حضوری ، آقاؐ!
ترے چاکر، ترے درباں، تہی داماں کیوں ہیں؟

نعت

میرا کسب ہنر، کمال نصیب
مدح احمد کا ہے، جمال نصیب

امر باطل کا جو کرے نابود
آپؐ کا ہو ہمیں جلال نصیب

نور حق کو جو منعطف کر دے
روشن آسا ہو وہ خیال نصیب

دم آخر درود ہو لب پہ
بس یہی ہو ہمیں مآل نصیب

آپؐ کے دم سے ہو گیا یک دم
زخم عصیاں کو اندمال نصیب

جس نے دیکھا ہے سبز گنبد کو
بعد رمضاں ہے وہ شوال نصیب

دل میں اترے جو سیرت اطہر
ہوں گے کا کیا کیا نہ ہم نوال نصیب

مجھ سے عاصی پہ ہو کرم آقاؐ
ہو جو طیبہ میں ارتحال نصیب

آپؐ کے در سے کیا نہیں ملتا
ہاں جو دل سے ہوا سوال نصیب

قول مولا ریاضؔ اپنائیں
رزق ہر دم رہے حلال نصیب

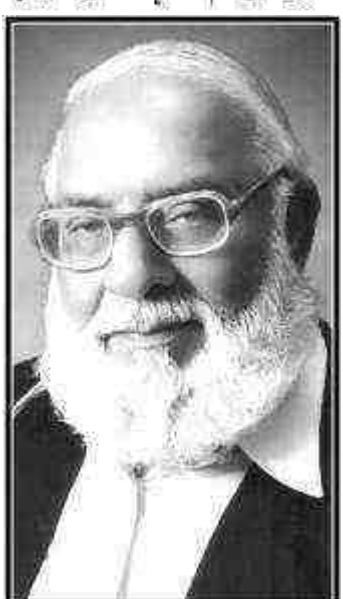

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

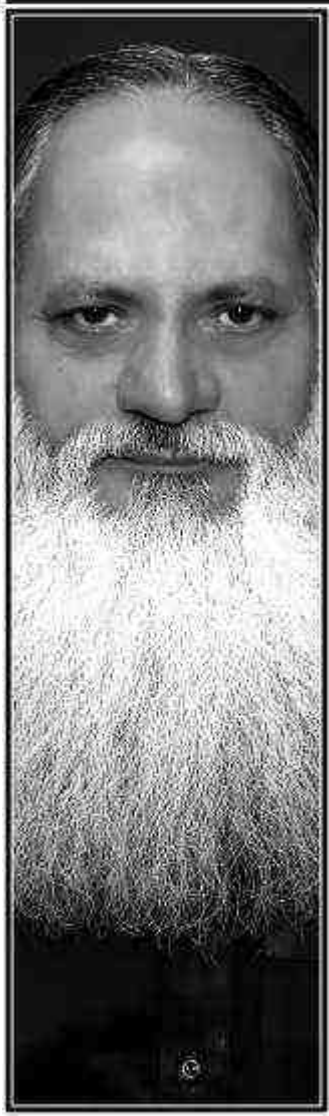

جلو میں جانے کیا کیا معجزے صلِ علیٰ اترے
حرا سے لے کے جب قرآں میرے خیر الوریٰ اترے

حدیثِ دل نئے پیرائے میں کہنے کو جی چاہے
سخن کے آسماں سے اب کوئی تازہ نوا اترے

حضورؐ خواجۂ گیہاں عریضہ پیش کرتا ہے
نیا لہجہ ملے مجھ کو، نیا رزقِ ثنا اترے

خدایا مجھ کو شامل کر دے اُن خوش بخت لوگوں میں
وہ جن کے صحن میں ہر شب مہِ اُم القریٰ اترے

وہ جس سے فصلِ گل آئے مری کشتِ تمنا میں
وہ بارانِ کرم مجھ پر بھی اب میرے خدا اترے

حرم کی خاص خوشبو آئے اس کے خیر مقدم کو
مسافر شہرِ طیبہ میں قمر جس وقت جا اترے

محمد یٰسین قمر

نعت

طیبہ میں حاضری کا درِ خواب کھل گیا
تعبیر میں بہشت کا یہ باب کھل گیا

برسا رہی تھیں نور، وہ روضے کی جالیاں
ہر سمت اِک دریچۂ مہتاب کھل گیا

محسوس لمسِ خاکِ مدینہ سے یوں ہوا
پیروں پہ فرشِ اطلس و کم خواب کھل گیا!

قابو میں رہ سکی نہ وہاں میری چشمِ نم
باندھا ہوا تھا اُس نے جو سیلاب، کھل گیا

اُن کی طرف سے پُرسشِ احوال کیا ہوئی
بے قابو ہو کے یہ دلِ بے تاب کھل گیا

روزانہ ایک نعت عطا ہو گئی نسیمؔ
ہر روز روشنی کا نیا باب کھل گیا

نسیمِ سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

حُسنِ آخر نے کیا حُسن کو آخر تجھ پر
آخری رُوپ دیا ، آخری سورت لکھی

نعتؐ

قرآن سارا نعت ہے نعتِ نبی پڑھوں
تم کو یقیں نہیں ہے تو بولو ابھی پڑھوں

آیاتِ پاک جن میں ہے شق القمر کا ذکر
اے چاند احتیاط اگر میں کبھی پڑھوں

کچھ کام ہے نہ کاج ہے فرصت ہے آج کل
فرصت کا سارا وقت درود نبی پڑھوں

قرآں تو میں نے گھر میں سجانے کو رکھ لیا
کیا کچھ ہے اس میں سمجھوں اگر میں کبھی پڑھوں

پوشیدہ بحرِ علم ہے آیات پاک میں
کافی ہیں ایک دو ہی کہ میں اب بھی پڑھوں

مجھ کو اگر عطا ہو تو لکھوں میں نعت پاک
اکرم ملے جو اذن مجھے تو تبھی پڑھوں

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مٹی سے مس ہوئی وہ سرانگشتِ آفتاب
یک سر گلاب رُو ہوئے نسرین تن تمام

نعت

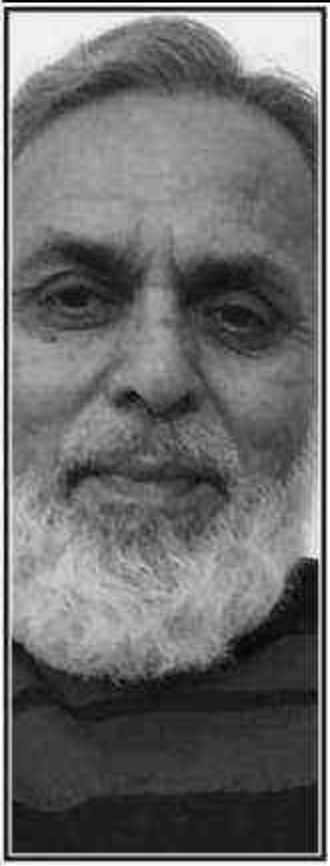

اللہ اللہ جمالِ آقائیؐ
کون لائے مثالِ آقائیؐ

کھل گئے جنّتوں کے دروازے
جب بھی آیا خیالِ آقائیؐ

پتھروں کو بھی بولتا دیکھو
دیکھو، دیکھو کمالِ آقائیؐ

میں اُن آنکھوں پہ جان و دل سے فِدا
جن کو ارزاں جمالِ آقائیؐ

جان و ایمان و سائبانِ انیس!
حُبِّ آقاؐ و آلِ آقائیؐ

محمد انیس انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

قصد مدح کیے بیٹھا ہے پھر خالد احمد
شانِ خدا، خوشبو کے کنگن، ڈھالے گا لوہار

نعت

خاور اعجاز

یا نبیؐ مجھ کو نہ محروم محبت رکھیے
مجھ گنہ گار پہ بھی سایۂ شفقت رکھیے

گاہے گاہے ہی سہی ہم پہ عنایت کی نظر
عاصیوں کو بھی سزاوار زیارت رکھیے

دامنِ رحمتِ عالمؐ میں پنہ مل جائے
اس سے بڑھ کے بھلا کیا کوئی بھی حاجت رکھیے

غیر سنجیدہ کوئی لفظ نہ آنے پائے
نعت کہنا ہے تو پھر ہوش سلامت رکھیے

پھول اوروں نے نچھاور کیے خاورؔ اب آپ
گلِ توصیف کوئی غنچۂ مدحت رکھیے

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

لکھتے ہی اُنؐ کا اِسم مُبیںؐ جھلملا اُٹھیں
عرشِ ورق پہ کاہ کشانِ سخن تمام

نعت

زباں پہ ذکرِ محمدؐ اگر نہیں ہوتا
رہِ حیات کا مطلق سفر نہیں ہوتا

ملے نہ خاکِ مدینہ جو اپنے چہرے پر
زمین زاد ، کبھی معتبر نہیں ہوتا

رواں دواں ہیں مدینے کی سمت خانہ بدوش
یہ کاروانِ وفا دربدر نہیں ہوتا

انھی کی آنکھ نے دیکھا وہ معجزہ بھی پھر
کہا جو کرتے تھے ''شق القمر'' نہیں ہوتا

وہ جس کے سینے میں عشقِ رسولؐ ہو، اس کو
جہاں کا خوف ، قیامت کا ڈر نہیں ہوتا

مرا خیال ، امانت ہے شہرِ طیبہ کی
مرا خیال ، مرے ساتھ گھر نہیں ہوتا

درودِ پاک کی تاثیر دیکھنا شوکتؔ
جگر تو ہوتا ہے ، سوزِ جگر نہیں ہوتا

شوکت محمود شوکت

نعتؐ

قرآں سمجھ کے ہوتا ہے دیدارِ مصطفیٰؐ
دل میں اُترتے جاتے ہیں انوارِ مصطفیٰؐ

حسنؓ و حسینؓ و فاطمہؓ اور بوتراب سے
اب بھی مہک رہا ہے چمن زارِ مصطفیٰؐ

بوبکرؓ، عمرؓ و حیدرؓ و عثمانؓ کی قسم
بے مثل و بے مثال ہیں سب یارِ مصطفیٰؐ

کافی نہیں ہے لا الہ بخشش کے واسطے
کرنا پڑے گا دل سے بھی اقرارِ مصطفیٰؐ

رحمت ہے دو جہان کی وہ صادق و امیں
دشمن کو بھی پسند ہے کردارِ مصطفیٰؐ

خیبر شکن علیؓ نے بتایا ہے کفر کو
باطل پہ کیسے گرتی ہے تلوارِ مصطفیٰؐ

تخلیق کائنات بھی ہے اُنکا معجزہ
حرکت ہے سب نظام کی رفتارِ مصطفیٰؐ

قسمت اگر مدینے ہمیں لے گئی کبھی
دیکھیں گے ہم بھی لازماً گلزارِ مصطفیٰؐ

ہے آمنہؓ کے پھول کا یہ معجزہ عقیلؔ
مہکے ہوئے ہیں کوچہ و بازارِ مصطفیٰؐ

عقیل رحمانی

نعتؐ

مثالِ ابر وہ جود و کرم نکلتا ہے
ثنا کے رستے پہ جب بھی قلم نکلتا ہے

نبی کی نعت سے روشن ہے رہگزارِ حیات
میں اس حصار سے نکلوں تو دم نکلتا ہے

میں جب حضور کے عفو و کرم کا سوچتا ہوں
مرے وجود کے صحرا سے نم نکلتا ہے

عروجِ حضرتِ انساں کی روشنی ہے جہاں
وہاں سے آپ کا نقشِ قدم نکلتا ہے

اُنہی کے در پہ بدلتے ہیں بے کسوں کے نصیب
اُنہی کے در پہ مقدر کا خم نکلتا ہے

کبھی نکلتی ہے کھڑکی کوئی مدینے کی
کبھی خیال میں بابِ حرم نکلتا ہے

کھلا ہے اس پہ حیاتِ ابد کا دروازہ
نبی کے شہر میں جس کا بھی دم نکلتا ہے

اترنے لگتی ہے تسکینِ دل پہ رحمت کی
درود پڑھنے سے دنیا کا غم نکلتا ہے

وہ جس سے پہلے کوئی اشک جھلملا اٹھے
وہ شعر ہو کے عقیدت میں ضم نکلتا ہے

دھنک اترتی ہے فکر و خیال پہ سرورؔ
ثنا کے رستے پہ جب بھی قلم نکلتا ہے

سرور حسین نقشبندی

نعت

میرے آقا کی جو مجھ پر بھی عنایت ہو جائے
مجھے بھی شہرِ مدینہ کی زیارت ہو جائے

مل گئی دولتِ کونین یہی سمجھوں گا
حاضری کی تیرے کوچے جو اجازت ہو جائے

جن پہ ہو لطف و کرم ان کے بلاوے آئیں
کیا خبر ہم پہ اگر اُن کی عنایت ہو جائے

ہوں گنہ گار مگر آس ہے روزِ محشر
میرے مولا تری نسبت سے شفاعت ہو جائے

شاہِ بطحا کے نگر گزریں مرے شام و سحر
درِ سرکار کی چوکھٹ مری قسمت ہو جائے

عامر بن علی

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

ہر لفظ چاہتا ہے کہ اُس ذکر میں ڈھلے
در پہ ہیں دست بستہ بتانِ سخن تمام

نعت

رسول پاک کی جس دل میں چاہت ساتھ رہتی ہے
خدا کی خاص اس بندے پہ رحمت ساتھ رہتی ہے

مہک آتی ہے لفظوں سے جب ان کی نعت لکھتی ہوں
خیالوں میں ہمیشہ ان کی مدحت ساتھ رہتی ہے

میں جب جب نام لوں ان کا مری توقیر بڑھ جائے
کہ ان کے نام نامی سے ہی عزت ساتھ رہتی ہے

سبب یہ ہے جو خود کو صاحب ثروت میں کہتی ہوں
نبی کے ذکر کی دامن میں دولت ساتھ رہتی ہے

میں ان کے جلوہ پرنور کو بس خواب میں دیکھوں
مری آنکھوں میں مدت سے یہ حسرت ساتھ رہتی ہے

مہکتا ہے مرا آنگن جو لب پہ ذکر ہو ان کا
"عجب خوشبو دروں کی بدولت ساتھ رہتی ہے"

مرے اللہ کا مجھ پہ کرم یہ کم نہیں افروز
جہاں بھی جاؤں میں آقا کی نسبت ساتھ رہتی ہے

افروز رضوی

نعت

یہ سب کچھ یہاں مصطفیٰ کے لیے ہے
نبی کی محبت خدا کے لیے ہے

ہیں نبیوں میں افضل ہمارے نبی بس
مقام اونچا خیرالوریٰ کے لیے ہے

درود ان پہ پڑھتا ہے رب جہاں بھی
سلامی یہ سب مجتبیٰ کے لیے ہے

وہ عرشِ بریں پہ بلائے گئے ہیں
رسائی ملی مقتدیٰ کے لیے ہے

جہاں کو ملی روشنی ان کے دم سے
یہ قرآں فقط والضحیٰ کے لیے ہے

فرح شاہد

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

پانچوں حواس آپ کے گھر کے غلام ہیں
سلطانِ پنج در، خدمِ پنج تن تمام

گلہائے عقیدت

حجرِ اسود کو کئی بار خدایا چوموں
اور ہر گام پہ پھر راہِ مدینہ چوموں

میرے آقاؐ مجھے گر حاضری کا شرف ملے
کعبہ تو دیکھ لیا، کعبے کا کعبہ چوموں

کبھی جن راہوں سے سرکارؐ میرے گزرے تھے
اپنی پلکوں سے میں وہ گلیاں، وہ رستہ چوموں

حاضری دے کے جو لوٹے وہی چہرہ دیکھوں
تلوے آنکھوں سے لگاؤں کبھی ماتھا چوموں

میری نظریں کسی منظر پہ ٹھہرتی ہی نہیں
کبھی جالی تو کبھی گنبدِ خضرا چوموں

روشنی مجھ میں سما جائے زمانے بھر کی
گر کبھی آپؐ کے میں نقشِ کفِ پا چوموں

کاش دو نفل پڑھوں میں بھی مصلے پہ ترے
اور پھر آپؐ کی محراب کا حلقہ چوموں

اس کے ہر حرف میں مدحت ہے مرے آقاؐ کی
جب اسے کھولوں، میں قرآن کا چہرہ چوموں

چوم کر دونوں انگوٹھوں کو رکھوں آنکھوں پر
آپؐ کا نام جب آئے انھیں آقاؐ چوموں

دیکھنے جاؤں میں اک روز حرا کی رونق
اور درِ ثور کی مکڑی کا میں جالا چوموں

اُنؐ کی نعلین کو میں تاج بنا لوں سر کا
اُنؐ کا پیوند لگا نور کا کُرتا چوموں

دیدِ آقاؐ کی ہو گر وقتِ نزع مجھ کو عقیلؔ
بھیگی آنکھوں سے بھی سرکارؐ کا چہرہ چوموں

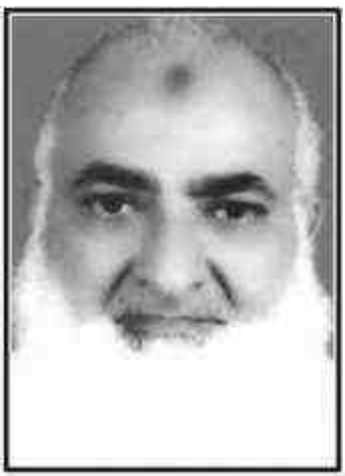

عقیل رحمانی

الحمدُ للّٰہ

[طوافِ حرمِ کعبہ کی یادگار]

صحنِ حرم ہے، رشکِ ارم ہے۔ الحمدُ للہ، الحمدُ للہ
ہے فضلِ رب کا، رب کا کرم ہے الحمدُ للہ، الحمدُ للہ

پیشِ نظر ہیں کیا کیا عطائیں
رحمت کی برسیں ہر سُو گھٹائیں
لب پر دعا ہے آنکھوں میں نم ہے
الحمدُ للہ، الحمدُ للہ

لب پر صدائے اللّٰہُ اکبر
دل میں مچلتی یادِ پیمبرؐ
ذکرِ الٰہی ہے جو بھی دم ہے
الحمدُ للہ، الحمدُ للہ

کعبہ کی عظمت، کعبہ کی شانیں
نوری فضا میں گونجیں اذانیں
دن رات جاری طوفِ حرم ہے
الحمدُ للہ، الحمدُ للہ

جوشِ دعا سے پگھلے ہیں جذبے
احرام باندھے نکلے ہیں جذبے
لبیک یارب، اب دم بہ دم ہے
الحمدُ للہ، الحمدُ للہ

جلوہ نما ہے اللہ کی رحمت
اللہ کی رحمت نے دی سعادت
ہو شکر جتنا بھی اُتنا کم ہے
الحمدُ للہ، الحمدُ للہ

مولا کی عظمت کی ہیں نشانی
اسود مقدس، رکنِ یمانی
جو کچھ یہاں ہے سب محترم ہے
الحمدُ للہ، الحمدُ للہ

مروہ، صفا کی رونق جدا ہے
دم دم کی نعمت بھی تو عطا ہے
شکرِ الٰہی! سب یہ بہم ہے
الحمدُ للہ، الحمدُ للہ

میری جبیں میں سجدے ہیں جتنے
دیکھے نہیں تھے بے تاب اتنے
جب سے نظر میں صحنِ حرم ہے
الحمدُ للہ، الحمدُ للہ

حامد یزدانی

قطعات

ہم جسے کہکشاں سمجھتے ہیں
وہ تو قدرت نے چاند تاروں سے
چاندنی کے حروف بنوا کر
نام لکھے ہیں ماہ پاروں سے

نور سا بھر گیا ستاروں میں
کہکشاں نے نمود پائی ہے
چاند کی پُر مزاح باتوں پر
رات جب کھل کے مسکرائی ہے

تم نے لفظوں میں مجھے دیکھا ہے
تم کبھی ان سے گذر کر دیکھو
کتنے پیکر ہیں مرے جذبوں میں
کاش تم ان میں اتر کر دیکھو

آؤ شطرنج ہی چلیے اے دوست
آؤ کاٹیں یہ رات آنکھوں میں
تم نگاہوں سے کوئی چال چلو
میں بچھاؤں بساط آنکھوں میں

بعض اوقات آئنہ خانے
غم سے اُجڑے گھروں میں ملتے ہیں
سطحِ دل پر نہ کر تلاشِ وفا
یہ گہر تو تہوں میں ملتے ہیں

ایسی ہلچل مچی سحر کے وقت
جیسے سب کائنات جاگ گئی
بات نکلی کہ منہ اندھیرے آج
رات سورج کے ساتھ بھاگ گئی

میں نجومی لطیف جذبوں کا
شہرِ دل کے سوال جانتا ہوں
تم محبت کی بات کرتے ہو
میں بہت سے کمال جانتا ہوں

خاور اعجاز

تضمین بر رباعی علامہ محمد اقبالؒ

ملا کیا ہے جہاں کی جستجو میں — کٹی ہے عمر ساری ہاؤ ہُو میں
عجب اک بے کلی ہے، کاخ و کُو — نہیں رکھا ہے کچھ بھی آرزُو میں
زباں انکی ہوئی ہے گفتگو میں
"نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بُو میں"

کوئی تاثیر تھی اس کے لہُو میں — ہزاروں خوبیاں تھیں اک عدو میں
کبھی پڑتا تھا وہ "میں" میں نہ "تو" میں — حقیقت میں ولی تھا اپنی خُو میں
سمندر گم ہو جیسے آب جُو میں
"خرد کھوئی گئی ہے چار سُو میں"

ہمیشہ کام آئی خیر خواہی — ہوئے مانوس سارے مرغ و ماہی
وہ درویشی خدا سے ہم نے چاہی — فدا ہو جس پہ شانِ بادشاہی
عبث ہے ساری شہرت، کج کلاہی
"نہ چھوڑ اے دل فغانِ صبح گاہی"

یہی دیکھا حیات خوب رُو میں — نہیں ہے فائدہ جام و سبُو میں
ہیں لاکھوں زخم قلبِ چارہ جُو میں — بچا کیا ہے؟ قتیلِ آرزُو میں
نہیں ہے تاب کچھ تار رفُو میں
"اماں شاید ملے اللہ ھو میں"

شوکت محمود شوکت

خالد احمد شخصیت اور شاعر

جناب خالد احمد کی سانحہ اور بڑی اس بار کرونا کی وجہ سے اس طرح خاموشی سے گزر گئی۔ جیسے خوشی پاس سے گزر جاتی ہے۔ میرا یہ مضمون 1992 میں "نقوش" میں شائع ہوا تھا (29 سال قبل) زندہ شخصیات کا یہ فخر ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ حال میں رہتے ہیں۔ جیسے غالب

اکثریت احباب خالد احمد اور نیازمند خالد احمد نے یہ مضمون شاید "نقوش" میں نہ پڑھا ہو اس لیے "بیاض" کے لیے بھیج رہا ہوں۔ امید ہے شامل اشاعت فرمائیں گے۔

محمد حنیف

میں نے اپنی زندگی کا آغاز کتابوں کے کاروبار سے کیا تھا۔ اس میں میرے شوق کا بھی کچھ دخل تھا۔ دیال سنگھ کالج کے سامنے دکان تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد کتابوں کے کاروبار کو ختم کر کے کھانے پینے کے کام میں بدل دیا تھا۔ دکان کے پیچھے ایک کمرہ اپنے اور دوستوں کے بیٹھنے کے لیے بنایا تھا جس میں چار کرسیاں، ایک میز، ایک چارپائی چائے کا سامان اور کچھ کتابیں رکھی رہتی تھیں۔ کتابیں بدلتی رہتی تھیں۔ جب نئی کتاب آتی، پڑھی ہوئی کتاب گھر چلی جاتی۔ شروع میں جو دوست اس کمرے میں آتے وہ اس کاروبار سے قبل کے دوست تھے اور ان کی اپنی ایک علمی ادبی اور فکری حیثیت تھی۔ اُن دوستوں کے ساتھ اُن کے اپنے دوست بھی تشریف لائے جن سے میری بھی نیازمندی اور کچھ سے دوستی ہو گئی اس کمرے میں نہایت نامور شخصیات نے مجھے شرف میزبانی بخشا۔ ان شخصیات کی قربت اور گفتگو سے میں نے بات کرنا سیکھا۔ ان کی میزبانی کو میں اللہ کا کرم اور اپنی بڑی عزت سمجھتا ہوں۔ اسی کمرے میں پانچ چھ سال قبل پروفیسر گلزار وفا نے خالد احمد سے تعارف کروایا تھا، مگر آج تعلقات کی نوعیت کچھ اس طرح ہے کہ دن، ماہ اور سال بیچ میں سے محو ہو گئے

محمد حنیف

ہیں۔ خالد احمد کا خاندان 1947 میں لکھنو سے ہجرت کر کے پاکستان آ گیا تھا اور لاہور میں نسبت روڈ پر دیال سنگھ کالج لائبریری کے پیچھے ایک مکان (6/A) میں قیام کیا۔ جناب احمد ندیم قاسمی ریڈیو پاکستان پشاور سے ملازمت چھوڑ کر لاہور آ گئے اور اسی مکان میں ان کے ساتھ مقیم ہوئے۔ جناب ندیم سے اس خاندان کے تعلقات روزِ اول سے ہی بہن بھائیوں والے تھے اور جب ان کے بھانجے ظہیر بابر کی شادی خالد احمد کی بڑی بہن خدیجہ مستور سے ہو گئی تو رشتہ داری بھی قائم ہو گئی۔

خالد احمد کے والد صاحب پاکستان نہیں آئے تھے۔ اُن کا انتقال ہندوستان میں ہی ہوا تھا۔ خالد احمد بچپن میں آج کے خالد احمد سے مختلف تھا۔ وہ کم گو اور تنہائی میں وقت گزارنے والا نوجوان تھا۔ اس عمر میں سیف الدین سیف صاحب کے بھتیجے خواجہ زبیر سے اس کی بڑی دوستی تھی۔ سگریٹ بھی خالد احمد کو زبیر نے لگائے تھے۔ شروع میں تخلص بھی اس دوست کے نام پر زبیر کرتا تھا۔ یہ تین چار دوست تھے جو شام کے وقت لائبریری کے پاس اکٹھے ہوتے اور شعر و ادب پر گفتگو کرتے تھے۔ بقول پروفیسر محمد صدیق (اسلامیہ کالج سول لائنز) خالد احمد اس عمر میں بھی بہت عمدہ شعر کہتا تھا۔ اس کی شعر گوئی اور اس کی طرف سے حوصلہ افزائی نے کئی دوستوں کو غزل گو بنا دیا تھا۔ آہستہ آہستہ دوستیاں بڑھتی گئیں اور خالد احمد ان ادبی بیٹھکوں کا رسیا بنتا گیا۔ اب اس طرح کی نشستیں وقت کی پابندی سے آزاد ہو گئی تھیں۔ بعض اوقات خالد احمد کو اس طرح کی محفلوں میں جب دیر ہو جاتی تو اس کے بڑے بھائی توصیف احمد خان آ کر اسے گھر لے جایا کرتے تھے۔ اس کا لہجہ ان امرتسری دوستوں کی قربت کی وجہ سے پنجابی ہو گیا تھا۔ اس کی شادی بھی پنجابی گھرانے میں ہوئی ہے۔ آج جب یہ کسی سے اردو میں بات کرتا ہے تو لہجے کے اعتبار سے قطعاً لکھنوی نہیں لگتا۔ اردو بولنے والا پنجابی لگتا ہے۔

خالد احمد کو لاہور سے شدید محبت ہے۔ اس شہر کی محبت آگے چل کر اس کی زندگی میں کافی پریشانیاں لائی۔ دیال سنگھ کالج سے بی ایس سی کیا تو احمد ندیم قاسمی صاحب نے فیصل آباد کوہ نور ملز میں ٹیکسٹائل پرنٹنگ کی ٹریننگ کے لیے ملازم کروا دیا جہاں خالد احمد کی تنخواہ اس وقت ایک پروفیسر سے زیادہ تھی۔ خالد احمد فیصل آباد چلا تو گیا مگر لاہور کی محبت اور دوستوں کی محفلیں فراموش نہ کر سکا۔ فیصل آباد سے جو خط وہ اپنے دوست پروفیسر محمد صدیق کو لکھتا اُن میں ہجر و فراق کی کیفیت ہوتی اور (جو اشعار تحریر ہوتے وہ بھی یاسیت کی کیفیت میں ڈوبے ہوتے۔ ٹیکسٹائل پرنٹنگ کی تربیت مکمل ہو گئی تو فرم نے مزید ٹریننگ کے لیے جرمنی بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ خالد احمد کو جب پتہ چلا کہ

اسے جرمنی بھیجا جائے گا تو اس کو ایسے لگا جیسے اس کے جسم سے روح نکالنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ از خود فیصلہ کیا اور کسی کو بتائے بغیر یہ عمدہ ملازمت ترک کر کے لاہور آ گیا:

شہر کی دھول سمٹ آئی ہے کیوں آنکھوں میں
کچھ تو کہہ، اب تیرے دل گیر کہاں ہوتے ہیں

اس ملازمت کو چھوڑ کر آنے کا دکھ سب سے زیادہ احمد ندیم قاسمی صاحب کو ہوا مگر خالد احمد خوش تھا کہ لاہور واپس آ گیا ہوں۔ لاہور آ کر گورنمنٹ کالج میں ایم ایس سی فزکس میں داخلہ لے گیا۔ احمد ندیم قاسمی روزنامہ امروز کے ایڈیٹر تھے۔ خالد احمد نے ساتھ ساتھ امروز میں لکھنا شروع کر دیا۔ اب طبیعت میں کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ دوستوں کی محفل میں ادبی علمی بحثیں رات گئے تک جاری رہتیں۔ ان محفلوں میں آنے والے آج کے یہ نامور ادیب تھے۔ گوہر ہوشیار پوری، امجد اسلام امجد، اقبال ساجد، بشر منذر، یوسف حسن، روحی کنجاہی، عدیم ہاشمی، طلیل عالی، نجیب احمد، اظہر سہیل وغیرہ۔ اسی دوران خالد احمد نے اپنی غزلیں اشاعت کے لیے "نقوش" اور "فنون" کو دیں۔ روحی کنجاہی نے جناب احمد ندیم قاسمی کو "زبیر" کی حقیقت بتا دی تو جناب قاسمی صاحب نے کاپیاں پریس سے منگوا کر زبیر کی جگہ خالد احمد کر دیا۔ اس دن سے خالد احمد کا ادبی نام بھی خالد احمد ہو گیا۔

"فنون" کے ذریعے خالد احمد نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے نسبت روڈ کے حلقے سے نکل کر ملکی سطح پر اپنی پہچان کروائی۔ اس کا شمار مستند شعرا میں ہونے لگا:

رچ بس چکا ہوں صورت خوشبو فضاؤں میں
کوئی جدا کرے، گل منظر سے کیوں مجھے

توصیف احمد خاں، خالد احمد کے بھائی ہیں۔ خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، عائشہ جمال، طاہرہ عابدی اور شاہدہ خیری بہنیں ہیں۔ احمد علی خاں، ظہیر بابر، حسن عابدی، حبیب الوہاب خیری بہنوئی ہیں۔ یہ تمام وہ نام ہیں جو ادب، صحافت اور وکالت میں بڑے ہیں۔

خالد احمد کے والد بھی صاحب دیوان تھے اُن کا نام محمد مصطفےٰ خان تھا۔ تخلص مذاح کرتے تھے۔ مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے احمق پھپھوندوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ اصولوں اور قدروں کے انسان کے تھے اور انھوں نے اپنی ساری زندگی ان کے تحت گزاری۔ احمق پھپھوندوی کی وجہ تسمیہ کے پس منظر میں ایک شاندار روایت ہے۔ تقسیم سے قبل انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی آزادی کے لیے جو لوگ جدوجہد کر رہے تھے محمد مصطفےٰ خان بھی اُن میں سے ایک تھے۔ کاروبار تو ان کا قلمی شورہ کا تھا جو ہندوستان بھر میں پھیلا ہوا تھا مگر ساتھ میں حکمت بھی کرتے تھے۔

انگریزوں کے خلاف آزادی کے حق میں نظمیں لکھتے اُن پر صرف احمق لکھ کر لاہور میں مولانا ظفر علی خان صاحب کو بھیج دیتے۔ مولانا خود بھی بہت بڑے حریت پسند تھے۔ وہ ان نظموں کو اخبار ''زمیندار'' میں نمایاں طور پر چھاپتے۔ جب ان نظموں کا چرچا ہوا تو انگریز سرکار حرکت میں آ گئی۔ پتہ کیا کہ ان نظموں کا خالق کون ہے۔ یہ پتہ تو مولانا ظفر علی خاں صاحب کو بھی نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو ظاہر بھی نہ کرتے۔ لفافہ کی مہر سے سراغ لگایا تو ضلع لکھنو اور ضلع اناوہ کے قریب پھپھوند شہر نکلا۔ متعلقہ ادارے کے حکام پھپھوند پہنچے۔ معلوم ہوا محمد مصطفےٰ خان مداح انگریزوں کے خلاف فعال کارکن ہیں اور شعر وشاعری بھی کرتے ہیں۔ پولیس آفیسر مطلب پہنچا اور محمد مصطفےٰ خان سے پوچھا ''یہ احمق کون ہے؟'' محمد مصطفےٰ خان صاحب نے جواب دیا ''یہاں ہم دو ہیں لہٰذا احمق ہم دونوں میں سے ایک ہوگا۔'' بات واضح ہو گئی۔ افسر اعلیٰ نے ہتھکڑی لگائی اور گرفتار کر کے لاہور لے آئے۔ لاہور کی عدالت میں فرد جرم عائد ہوئی اور جج نے انگریز سرکار کے خلاف نظمیں لکھنے کے جرم میں قید با مشقت کی سزا سنائی۔ جیل میں بیڑیاں بھی پہنائی گئیں مگر ان کے عزم و حوصلہ میں قطعاً کوئی لچک پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس حالت میں بھی کسی نہ کسی طرح کوئلہ حاصل کرتے یا جیسا تیسا بھی کاغذ ملتا اس پر نظم لکھ کر جیل سے سمگل کر کے مولانا ظفر علی خان کو بھجوا دیتے۔ مولانا ظفر علی خان کو بھی اب پتہ چل چکا تھا کہ آپ پھپھوند کے ہیں لہٰذا پھپھوند کے عوام کو یہ جتلانے کے لیے کہ تم میں کیسے کیسے بہادر نڈر اور آزادی کے متوالے انسان موجود ہیں، احمق کے ساتھ پھپھوندوی کا اضافہ کر دیا۔ محمد مصطفےٰ خان مداح نے اپنی زندگی کے متعدد سال آزادی کی لڑائی لڑتے ہوئے جیل میں کاٹے۔

خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' میں میاں صاحب کا کردار خالد احمد کے والد جناب مصطفےٰ خان مداح کی زندگی کے رُخ کے کچھ تاثر پیش کرتا ہے:

جبر کی حد اور تھی ، صبر کی حد اور تھی
بے خبرو ، کیا خبر ایک خبر اور ہو

خالد احمد کی والدہ بھی اعلیٰ ادبی ذوق رکھتی تھیں مگر خالد احمد نے اپنی ذات کی پہچان صرف خالد احمد کے نام سے کروائی۔ خالد احمد اپنی جگہ ایک مکمل نام ہے:

ہم پجاری بھی ہیں خالد فقط آزر تو نہیں
بت تراشے ہیں، خدا مانا ہے، خود پوجے ہیں

خالد احمد سے جن دنوں میرا تعارف ہوا، وہ واپڈا ہاؤس میں کام کرتے تھے۔ دفتری اوقات سے فارغ ہو کر دفتر ''فنون'' میں شام کا وقت گزرتا تھا جو ان دنوں گنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے بروم ہوسٹل کے

ساتھ کھائی چڑھ کر تھا۔ میں دفتر ''فنون'' میں چار پانچ مرتبہ خالد احمد کے ساتھ گیا۔ چونکہ عام طور پر وہ دفتر جاتے ہوئے یا دفتر ''فنون'' سے فارغ ہو کر گھر آتے ہوئے خیریت پوچھ کر جاتے اس لیے ملاقات تقریباً روز کا معمول تھا۔ خالد احمد کے ساتھ اُن کے ادیب اور شاعر دوست بھی ہوتے۔ خالد احمد کی وجہ سے ان دوستوں کی محبت شفقت اور دوستی مجھے بھی حاصل ہوئی۔ خالد احمد ادبی اور نجی محفلوں میں مجھے ساتھ لے جاتے اور اپنے دوستوں سے میرا تعارف خوبصورت اور محبت آمیز لفظوں میں کرواتے۔ جن شاعر ادیب دوستوں کی کتابیں اُن کے ہاتھ آتیں مجھے بھی عنایت کرتے۔ بعض اوقات دوستوں کی کتابیں خرید کر بھی احباب میں بانٹتے۔ ان میں میں بھی شامل ہوتا۔ خالد احمد کو جناب احمد ندیم قاسمی سے رشک کی حد تک عقیدت ہے۔ ندیم صاحب کے خلاف بات سننے کی قوت برداشت اس میں ہے ہی نہیں۔

شروع کی ملاقاتوں کا ایک واقعہ ہے۔ ادبی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے جناب فیض احمد فیض اور جناب قاسمی صاحب کا تقابل اور اہل قلم کانفرنس پر بات کرنا چاہی تو خالد احمد نے مجھے فوراً ٹوک دیا اور کہا ''ندیم صاحب کا جو مقام ہے وہ انتہائی محترم ہے۔ اس پر دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ اگر آپ کے کچھ ذاتی خیالات ہیں تو میرے سامنے اس موضوع پر بات نہ کریں پلیز۔'' حالانکہ مخالفت والی کوئی بات نہیں تھی لیکن خالد احمد کے چہرے کا رنگ اور اس کا لہجہ دیکھ کر میں نے موضوع بدل دیا۔ جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کے لیے خالد احمد اپنے جذبات کا اظہار ''ہتھیلیوں پہ چراغ'' میں اس طرح کرتے ہیں:

تیری بلندیوں سے سو آبشار نکلے
سب کم کنار آئے سب بے کنار نکلے

....

ندیم صاحب کی سترویں سالگرہ کی تاریخ قریب آ گئی تو خالد احمد کی جذباتی کیفیت دیکھنے والی تھی، حالانکہ منتظمین میں اس کا نام صرف کارڈ کی حد تک تھا، مگر دورانِ گفتگو موضوع خواہ کوئی بھی ہوتا بات اس جملہ پر ختم کرتا ''سالگرہ کی تاریخ یاد ہے نا؟ یار جلدی آ جانا!'' میں نے دیکھا ہے ندیم صاحب بھی خالد احمد کی بات کا بہت خیال کرتے ہیں۔ کرشن نگر میں اعجاز رضوی صاحب کا ولیمہ تھا۔ تقریب کا انتظام دیکھ کر لگتا تھا کھانے میں ابھی کافی دیر ہے۔

دوسرے راولپنڈی سے اعجاز رضوی صاحب کے سسرال والوں کو بھی ابھی آنا تھا۔ میں نے خالد احمد سے کہا۔ سامنے 21 ہیرن روڈ پر میرا گھر ہے اگر ممکن ہو تو ندیم صاحب اور آپ دوست ایک کپ چائے میرے گھر چل کر پئیں۔ خالد احمد نے قریب کھڑے ندیم صاحب سے کہا ''ندیم بھائی، حنیف صاحب ہمارے

بڑے پیارے دوست ہیں۔ اُن کی خواہش ہے آپ ایک کپ چائے اُن کے گھر چل کر پئیں۔" ندیم صاحب کے ساتھ اختر حسین جعفری صاحب۔ خالد احمد، نجیب احمد صاحب، عباس تابش صاحب، ڈاکٹر طاہر اسلم گورا صاحب، اعجاز رضوی صاحب، یونس بٹ صاحب میرے گھر تشریف لائے اور گھنٹہ پون گھنٹہ وہاں بیٹھے۔ یہ نشست آج بھی میرے لیے قابل ذکر ہے۔ دو تقریبات اور بھی ہیں جو میرے نزدیک خاص اہمیت کی حامل ہیں جن میں میری شمولیت خالد احمد کی وجہ سے ہوئی۔ ایک تقریب قرۃ العین حیدر صاحبہ کے ساتھ اور دوسری عبداللہ حسین صاحب کے ساتھ۔ چند سال قبل قرۃ العین صاحبہ پاکستان آئیں تو ایک شام اُن کے ساتھ ڈاکٹر طاہر اسلم گورا صاحب نے اپنے گھر منعقد کی۔ ہندوستان اور پاکستان کی صحافت اور سیاست کی وجہ سے، مہمان نے کہا "تصویریں نہیں بنیں گی، رپورٹنگ نہیں ہو گی۔ لوگ زیادہ نہ ہوں۔" کی خواہش کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر طاہر اسلم گورا صاحب نے اس خواہش کا پورا پورا خیال رکھا۔ اس تقریب میں قرۃ العین حیدر صاحبہ نے ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب سے اُن کی کتاب کے بارے میں چونکا دینے والا سوال کیا، مگر اجمل نیازی صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ پوری تقریب میں مکمل خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اگر اس تقریب کی رپورٹنگ ہوتی تو یقیناً ادب کے طالب علم کے لیے فائدہ مند ہوتی۔

عبداللہ حسین صاحب سے ملاقات اختر حسین جعفری کے گھر ہوئی۔ عبداللہ حسین صاحب کے اعزاز میں جعفری صاحب نے رات کا کھانا، کیا تھا۔ اس تقریب میں ادب کے تمام محترم نام موجود تھے۔ فضا میں گھریلو پن تھا۔ ادب، نظم، لطیفے بازی وغیرہ، اُردو ادب کے دو بڑے اور جنٹل ناول، ناولٹ، افسانے لکھنے والی شخصیت سے بالشافہ گفتگو اور ان کی نجی زندگی کی جھلک دیکھنا یہ سب خالد احمد کی محبت کا مرہون منت ہے۔

خالد احمد دوستوں کی محفل میں ادب کافی فراوانی سے بولتا ہے جو بچہ ابتدائی بول چال میں گلیوں سے سیکھتا ہے۔ اس شخص کے واقعہ بیان کرنے کا انداز انتہائی دلچسپ ہے۔ واقعہ بیان کرنے سے قبل گالیاں، درمیان میں گالیاں۔ ساتھ چہرہ، زبان، ہاتھوں کی انگلیاں تک بیان میں متحرک۔ چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ۔ واقعہ بیان کرنے کا مجموعی تاثر یہ ہوگا۔ جناب سب کچھ میرے سامنے ہوا ہے اور جو کچھ ہوا ہے وہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس طرح ہوگا خواہ واقعہ صدی قبل کا ہو۔ خالد احمد کے شعر سننے کا انداز بہت مؤدبانہ ہے۔ دوست اپنا کلام سنا رہا ہے۔ یہ سر نیچے آنکھیں بند کیے ہمہ تن گوش ہے۔ ساتھ ساتھ داد بھی دیے جا رہا ہے۔ اس کے انداز سے

صاحب کلام کو حوصلہ، خوشی اور تحریک ملتی ہے۔ بعض اوقات دوستوں کی حمایت میں غلو کی حد تک چلا جاتا ہے، جس سے کچھ دوستوں کو کوفت بھی ہوتی ہے مگر چونکہ یہ غلو ایک دوست کے خلوص کا ہوتا ہے اس لیے فضا زیادہ دیر مکدر نہیں رہتی۔ جس محفل میں خالد احمد ہوگا وہاں لطیفوں، کھری باتوں اور قہقہوں سے جان ڈال دے گا۔ دفتر "فنون" ہو یا کسی ٹی سٹال کا گوشہ، اُس کی شخصیت کا سحر ایسا ہے کہ اس کے قریب کرسی کا ملنا مشکل ہو جائے گا۔

مجھ کو دیکھے گا تو اپنا آپ یاد آ جائے گا
خود کو تیرے سامنے کچھ اس طرح لاؤں گا میں

.....

خالد احمد اپنی ذات پر تنقید سے قطعاً بدمزہ نہیں ہوتا بلکہ تنقید نگار کی طرف ایسی شفیق نگاہوں سے دیکھے گا، جس سے تنقید نگار کو مزید حوصلہ ملے گا۔ اس طرح کا منظر "حلقہ ارباب ذوق" میں دیکھا جہاں خالد احمد نے جدید نظم پر مضمون پڑھا۔ ڈاکٹر سعادت سعید صاحب اور دوسرے لوگوں نے اس مضمون پر خوب تنقید کی مگر یہ اُن کی طرف دیکھ کر اس طرح مسکرا رہا تھا جیسے اس تنقید پر اس کو بھی خوشی ہو رہی ہے۔

خالد احمد نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی بہت کرتا ہے اور یہ ہنر اُس نے جناب احمد ندیم قاسمی سے سیکھا ہے۔ نئے لکھنے والوں کو، شعر، تنقید، نثر، لفظوں کے استعمال کے وہ رموز سمجھائے گا جس سے ان پر فکر و نظر کے زاویے مختلف انداز سے طلوع ہوں گے۔ نئے لکھنے والے خالد احمد کو اپنا اُستاد سمجھتے ہیں مگر یہ اُن کو اپنا دوست بناتا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کچھ نئے لکھنے والے جو خالد احمد کو اپنا گرو کہتے تھے جب اُن میں سے کچھ صاحب کتاب ہو گئے تو اُن میں سے کچھ نے خالد احمد کی ذات اور شاعری پر تنقید کی مگر خالد احمد جب بھی اُن سے ملا محبت، شفقت اور احترام میں کوئی فرق نہیں آنے دیا:

کون سمجھے گا ایسا ربط لطیف
وہ مرا تھا مگر مرا بھی نہ تھا

.....

یہاں میں خالد احمد اور اُن کے سینئر دانشوروں کی خدمت میں عرض کروں گا کہ وہ اس بات کا احساس کریں کہ نوجوان لکھنے والوں میں مخالفت کا رجحان بڑھ رہا ہے جبکہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ جب میں نے اس رجحان کا تجزیہ کیا تو مجھے نظر آیا کہ جس طرح قومی زندگی میں قابلیت کو رشوت اور سفارش نے نظر انداز کر دیا ہے اور اس کے ردِ عمل کے طور پر پڑھے لکھے اعلیٰ ڈگری یافتہ نوجوانوں میں بے دلی، بے ادبی اور انارکی آ گئی ہے، اسی طرح ادب میں بھی صاحب منصب، افسر، ابلاغ کے اداروں سے منسلک لوگ اور کچھ ادب پرور پبلشرز اور اُن تنظیموں نے جن کے ذاتی سیاسی یا مادی مقاصد ہیں اچھا لکھنے والے نوجوانوں کو پس منظر میں دھکیل

دیا ہے، جس سے ان نوجوانوں میں مایوسی اور اور لہجے میں جھنجھلاہٹ پیدا ہوئی ہے۔ دوسرے اب چند ہزار روپے خرچ کر کے صاحب کتاب ہونا آسان ہوگیا ہے۔ اس نمبر دو کلاس نے بھی اچھا لکھنے والوں کا راستہ کاٹنے میں اپنا اثر رسوخ استعمال کیا ہے:

عشق کا نام لیا اہلِ ہوس نے خالد
روشنی جوڑ کے یاروں نے بنائے سائے

.....

خالد احمد اور بزرگ لکھنے والوں سے میری گزارش ہے کہ وہ گلیمر، منصب اختیارات اور مفادات میں جکڑے رجحان کی بیخ کنی کریں۔ یہاں میں نئے لکھنے والوں کی خدمت میں بھی عرض کروں گا کہ وہ اپنی توانائی، اہل قلم کانفرنس، ٹی وی، سرکاری یا غیر سرکاری ملکی مشاعروں میں شرکت کوشش میں صرف نہ کریں بلکہ معنویت احساس کے حسن وتراکیب کے کمال پر فکر کریں۔ اگر ان کی شاعری میں اور نثر میں ابلاغ ہوگا تو وہ از خود مقبول ہوں گے، عوام میں بھی خواص میں بھی۔ نوجوان لکھنے والوں میں زیادہ ستائش کا جذبہ بھی فروغ پا رہا ہے ستائش اک ایسا زہر ہے جو فنکار کی تخلیقی صلاحیتوں کو منجمد کر دیتا ہے:

لوگ ہوں یا اجرام خلائی
صرف اصولوں کو ہے دوام

.....

خالد احمد کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے۔ ہر دوست کا خیال ہے خالد احمد میرا قریبی دوست ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے مگر اس کا مثالی تعلق نجیب احمد سے ہے۔ خالد احمد کی پرکشش شخصیت کی مثال نجیب احمد ہیں جنھوں نے محمد طفیل شیخ کو دوزن خالد احمد، نجیب احمد کا نام دیا۔ ان کا دفتری اوقات کے بعد کا وقت یکجا گزرتا ہے۔ شعر کے مصرعہ سے لے کر ادبی گروہ بندی تک، معاشی وسائل سے لے کر گھریلو مسائل تک باہم مشاورت سے طے کرتے ہیں۔ کسی تقریب میں ان کا یکجا دکھائی نہ دینا دوستوں کے لیے حیرت کا باعث ہوتا ہے۔ خالد احمد سگریٹ اور چائے کثرت سے پیتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ اس کی خوراک کا حصہ بن گئی ہیں۔ میرا خیال ہے یہ صرف چائے اور سگریٹ کے ساتھ ہفتوں زندہ رہ سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے محفل دوستوں کی ہو اور موضوع ادبی اور علمی ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ جس کمرے میں میں یہ محفل ہو اس کی چھت نہ ہو ورنہ دھوئیں اور بھاپ سے اڑ جائے گی۔

خالد احمد کی دعوتیں بھی اس کے خلوص کا مظہر ہوتی ہیں۔ یہ دعوتیں ہوٹل کے بجائے وہ گھر پر کرتا اور تمام ڈشیں جو کافی تعداد میں ہوتی ہیں گھر میں ہی تیار کی ہوتی ہیں۔ ان تقریبات میں اس وقت لاہور میں موجود، یورپ، ہندوستان، عرب ریاستوں، چین سے آئے ہوئے شاعر، ادیب بھی شریک

ہوتے ہیں۔ بطور میزبان خالد احمد مہمانوں کے آگے سراپا سپاس ہوگا۔ بحیثیت مہمان کافی خوش خوراک ہے۔ ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ایک دن کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نجیب احمد نے کہا میرا دل لکشمی چوک جا کر دال چاول کھانے کو چاہ رہا ہے۔ ہم سب جو تعداد میں پانچ تھے لکشمی چوک پہنچے۔ پانچ پلیٹ دال چاول کا آرڈر دیا۔ خالد احمد نے مزید تین پلیٹ دال چاول ایک شامی کباب اور ایک پلیٹ سلاد کی کھائی۔ نجیب نے پوچھا ___ ''اور!

خالد احمد نے جواب دیا'' ___ نہیں یار اب کھانا گھر جا کر کھاؤں گا۔ آج بیوی نے خاص طور پر قیمہ دھنیا بھونا ہے۔''

خالد احمد اپنے دوستوں کے بچوں سے بھی بہت محبت کرتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے بچے خواہ کسی بھی عمر کے ہوں خالد احمد اپنی جیب کی وہ رقم بھی جو گھر کے لیے اُس دن کی ضرورت کی ہوگی اُن کو دے کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ ایک دن خالد احمد میرے گھر آیا۔ میں نے بیٹوں کا تعارف کرواتے ہوئے کہا بڑے بیٹے سہیل حنیف نے بی ایس سی انجینئرنگ فرسٹ کلاس میں سکالرشپ کے ساتھ پاس کی ہے اور آج ہی رزلٹ آیا ہے اور چھوٹا بیٹا سلمان حنیف ایل ایل بی کر رہا ہے اور اس کو پڑھنے کا بھی شوق ہے اور اسی شوق کی خاطر ایک قومی اخبار میں بلا معاوضہ دو تین گھنٹے کام کرتا ہے۔ خالد احمد کے چہرے پر مخصوص مسکراہٹ پھیل گئی۔ بیٹوں کو پاس بٹھا کر ان کی صلاحیتوں اور مستقبل کے بارے میں وہ پیشین گوئیاں کیں کہ مجھے تصور کی آنکھ سے سب حقیقت نظر آنے لگا۔ خالد احمد کی محبت اور خلوص سے بھرپور باتوں سے ہمارے چہروں کے درمیان تاثر کا جو ایک ہالہ بنا وہ کہکشاں کے رنگوں سے بھی زیادہ خوبصورت دلکش اور دل آمیز تھا۔ میرا خیال ہے جو بچہ ایک بار خالد احمد کے ساتھ مکمل نشست کرے گا وہ خالد انکل کی تلاش جاری رکھے گا:

اس طرح بانٹ کہ سمجھے نہ کوئی لوٹ کا مال
وار کر سہرے پہ بچوں میں لٹا دے مجھ کو

.....

انکسار، لاپروائی، بے ترتیبی اس کی ذات کا حصہ ہیں۔ وضعداری، دوست داری اور عزت نفس کا اظہار عمل سے کرتا ہے۔ تصوف کا فیشن۔ آجکل ادیب اور ادب میں سرایت کر رہا ہے۔ خالد احمد میں بھی اس کا اثر بعض اوقات نظر آتا ہے۔ جس وقت اس پر شعر وارد ہوتا ہے اس کیفیت میں بھی میں نے اُس کو دیکھا ہے۔ آنکھیں آدھی بند، چہرے اور ہاتھوں میں ہلکی ہلکی لرزش سی، ایک ہاتھ میں سگریٹ، دوسرے میں قلم، ساتھ ساتھ گنگناہٹ۔ مجھے اس وقت خالد احمد ایک شاعر کے ساتھ ساتھ پکے راگوں کا ماہر بھی لگتا ہے۔ اُس نے ٹی وی کے لیے بے شمار گیت تخلیق کیے۔ کئی لڑکوں

کو کوشش کر کے اداکار بنوایا اور کئی اداکاروں کو جنھیں پروڈیوسر صاحبان ذاتی طور پر ناپسند کرتے تھے ان کے کام کے لیے سفارش کی۔ جب یہ ٹی وی پر ہوتا ہے تو فنکاروں، سازندوں بلکہ سازوں اور اردگرد کے ماحول کا حصہ بن جاتا ہے۔

میں نے خالد احمد کی پُرسکون زندگی میں تلاطم برپا ہوتے بھی دیکھا۔ یہ واقعہ اُس وقت رونما ہوا جب اس کا تبادلہ ترپیلا کر دیا گیا۔ ترپیلا جانے پر جو اس کی حالت تھی الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ بلڈ پریشر انتہائی کم ہو گیا تھا دوا کی کثرت دیکھ کر جو وہ ہر چار گھنٹے بعد کھاتا تھا، خوف آتا تھا۔ ترپیلا جانے پر تنخواہ بھی کم ہو گئی تھی جس سے ظاہر ہے گھر کا بجٹ بھی متاثر ہوا۔ خالد احمد کی پریشانی کم کرنے اور گھر کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ان دنوں بھابی صاحبہ نے اپنے کچھ زیور بھی فروخت کیے۔ خالد احمد جب اپنی بیوی کے خاموش تعاون کا ذکر کرتا تو اس پر سخت وحشت طاری ہوتی۔ میرا خیال ہے اگر خالد احمد پر بیوی بچوں کا دباؤ نہ ہوتا تو یہ نوکری بھی چھوڑ کر آ جاتا اور خوش ہوتا کہ لاہور اور دفتر ''فنون'' اُس سے نہیں چھوٹا۔ کچھ عرصہ بعد تبادلہ گوجرانوالہ ہو گیا مگر آنا جانا، کرایہ اور وقت کا ضیاع اس کے لیے وبالِ جان بنا رہا۔ مگر اس موضوع پر بات کرنا اُس نے اب کم کر دیا تھا۔ دفتر ''فنون'' ٹی وی، ادبی محفلوں سے رابطہ کم ہو گیا تھا جس سے ذہنی اور جسمانی طور پر یہ تھکا تھکا نظر آتا تھا:

ربط کس سے تھا، کسے، کس کا شناسا کون تھا
شہر بھر تنہا تھا لیکن مجھ سا تنہا کون تھا

.....

ایک رات کے آٹھ بجے میں کمرے میں اکیلا بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ خالد احمد بھابی صاحبہ اور نجیب احمد صاحب کمرے میں آئے۔ خالد احمد کرسی پر بیٹھ گیا اور بھابی صاحبہ سے مخاطب ہو کر کہا ''میں اب کچھ دیر یہاں بیٹھوں گا پھر پاک ٹی ہاؤس جاؤں گا۔'' بھابی صاحبہ نے بڑے تحمل اور بردباری سے جواب میں کہا___ ''خالد! مجھے کچھ پتہ نہیں۔ تم جہاں بھی جاؤ گے میں بھی تمھارے ساتھ جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ بھی وہاں بیٹھ گئیں۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''حنیف بھائی، گھر میں صبح سے شام تک سو کام ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ بچوں کی پڑھائی کا ہے۔ عزیز آئے گئے ہوتے ہیں۔ اب ٹرانسفر کا انتقام یہ ہم سے لے رہے ہیں۔ دفتر سے آ کر باہر نکل جاتے ہیں۔ رات کو گیارہ بارہ بجے آتے ہیں اس لیے میں سخت پریشان ہوں۔'' بات بھابی صاحبہ کی درست تھی۔ میں نے خالد احمد سے عرض کی جناب آپ کا طریقِ کار بہت غلط ہے حالات سے فرار کا مطلب گھر والوں پر ظلم ہے۔ خالد احمد خاموشی سے اُٹھے بھابی صاحب کے ساتھ گھر چلے گئے۔ اُس کے

بعد کے رویّے سے محسوس ہوا خالد احمد نے اس کیفیت پر بھی قابو پالیا ہے۔ میرے نزدیک خالد احمد خوش نصیب انسان ہے جس کو اس قدر ذمہ دار سلیقہ مند خوش خلق۔ مہمان نواز ہر طرح کے حالات میں ہاتھ بٹانے والی بیوی ملی۔

خالد احمد دو مرتبہ لندن بھی گیا، مشاعرہ پڑھنے کے لیے اُسے یہ دعوت غالباً اُس کی شاعری اور ذاتی حیثیت کی وجہ سے ملی۔ اس شخص کا لندن جانا اور آنا مجھے روزمرہ کا معمول لگا۔ جب جارہا ہوتا رکشہ روک کر آواز دے کر بتاتا ''میں جارہا ہوں!'' اور جب واپس آتا اسی طرح رکشہ روکتا، علیک سلیک کے بعد بتاتا، میں خیریت سے آگیا ہوں، اب گھر جا رہا ہوں۔ گھر والوں کو بتا کر آتا ہوں، پھر بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ عام لوگوں کی طرح اُس نے لندن کے واقعات سنانا کرنہ تو بور کیا اور نہ زبردستی کا سفرنامہ نگار کہلوانے کے لیے سفرنامہ لکھا نہ ہی وہاں کی میموں اور پبوں کی رنگین جذباتی مناظر کی لفظی نقش نگاری کی اور نہ ہی مردانہ و زنانہ منظرنگاری کرکے جذباتی میں ہیجان پیدا کیا۔ مجھے اُس کا یہ انداز مناسب اور حقیقت پسند انسان کا سا لگا۔

خالد احمد میں ایک انسان کے ناتے اچھائیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی مگر مجھے ہمیشہ اُس کی اچھائیاں غالب نظر آئیں:

مایو نہ ہمیں مصلحتِ وقت کے گز سے
ہم لوگ تو لمحے ہیں جو قرنوں پہ کھڑے ہیں

خالد احمد کا ندیم صاحب اور ''فنون'' سے تعلق لازم وملزوم ہے۔ لاہور سے تبادلے کی وجہ سے دفتر ''فنون'' میں حاضری اور رسالہ ''فنون'' میں شرکت پہلے کی طرح نہیں رہی۔ تاہم اس عرصہ میں کچھ غزلیں اور دو یادگار نظمیں ''فنون'' میں چھپیں۔ ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' اور ''رحمان بابا کے لیے'' یہ نظمیں پڑھ کر فکر کے در یچے وا ہوتے ہیں۔ ''ہتھیلیوں پہ چراغ'' ''تشبیب'' اور نئی کتاب ''پہلی صدا پرندے کی'' کی غزلوں اور نظموں میں خالد احمد اپنے عہد کے بڑے فن کاروں میں سے ایک نظر آتا ہے۔ خالد احمد تنقید نگار بھی ہے جو ''فنون'' میں اہم موضوعات پر ''بین السطور'' کے نام سے شذرے تحریر کرتا رہا لیکن خالد احمد مشہور بطور شاعر ہوا۔

''تشبیب'' کے بعد ''ہتھیلیوں پہ چراغ'' شاعری کی دوسری کتاب ہے، جس میں حمد، نعت، قصیدہ، غزل نظم سب کچھ ہے اور صنف اپنی جگہ اعلیٰ معیار کا درجہ رکھتی ہے۔ خالد احمد نے کتاب کے فلیپ پر لکھا ہے۔ ''میری شاعری لہو میں رچ جانے کے لیے ہے۔ میرا قاری میرا دمساز ہے۔ میرا قاری میرا دل ہے، میں دلوں پر لکھتا ہوں۔'' ''ہتھیلیوں پہ چراغ'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بے جہت فکر کے ہاتھوں میں کماں کیوں دی تھی
اب ہدف تو ہے تو کیا، تیر تو چل جانا تھا

ہر فحص حقائق کی کڑی دھوپ کے ڈر سے
تانے ہوئے اوہام کی چادر نظر آیا

چُپ کا زہر پی لینا، غم کے ہونٹ سی لینا
مصلحت نہیں یارو، بات بے حسی کی ہے

پھولوں میں رنگ اور نشوں میں نشہ نہ تھا
جب تک ترا جمال لہو میں رچا نہ تھا

پلکوں کی ہتھیلیوں پہ خالد
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں

ہر قدم جاری تھی نادیدہ سہاروں کی تلاش
ہر قدم منت کشِ اغیار ہونا تھا، ہوئے

بے حس کسی خنکی سے پگھلتے نہیں خالد
اے ماں ترے بیٹے ترے اشکوں پہ کھڑے ہیں

.....

''تشبیب'' خالد احمد کی پہلی کتاب ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور عقیدت کا اظہار ہے۔ انتہائی چھوٹی بحر میں احساسات کا اظہار اس قادر الکلامی سے ہوا کہ پڑھنے والا بھی جذب و مستی کی کیفیت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ اس قصیدے میں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دوستوں کے لیے بھی دعا گو ہے۔ مختصر بحر میں کیا خوبصورت انداز بیان ہے:

آپؐ ہیں گر قرآن
رحل ہے آپ کی آل
آپؐ کا ورثہ ہیں
فاطمہ کے دو لال
آپ کا ترکہ ہے
ترک مال و منال
بستر دوہرا ٹاٹ
نیند ہو جس پہ محال
آدھی نانِ جویں
پانی ایک پکھال
فاقے یوں کاٹے
فاقے دیئے اُجال

.....

جامعہ عثمانیہ دکن کے سابق پرنسپل حافظ سید محمد نعمان صاحب لکھتے ہیں:

''مجھے اس کی ''تشبیب'' میں حضرت کعب بن زبیرؓ، امام بوصیریؒ، نظامی، جامی اور محسن کی قصیدہ گوئی کی متام تر لطافتیں بھی نظر آئی ہیں اور اس روایت کے نئے امکان بھی نجم کے حسنِ طبیعت نے عرب کے سوز دروں سے ہم آہنگ ہو کر وہ رنگ دکھائے ہیں کہ دل سے بے اختیار ماشاءاللہ کی صدا نکلتی ہے۔ عربی اور ہندی روایاتِ شعر کے دل نشیں امتزاج، تمام مشرقی زبانوں سے فراخدلانہ استفادے، حدود کی بصیرت، اظہار کی ندرت، نظر کی وسعت اور عقیدت و محبت کی رنگا رنگی کی دولت اُردو قصیدہ اپنے نقطۂ کمال تک پہنچ گیا ہے۔''

''لمحہ تیار ہے'' ایک اعلیٰ درجہ کی نظم ہے

جس میں خالد احمد کا ذاتی دکھ ماں کی رحلت
کا دکھ، آفاقی دکھ بن گیا ہے:

مری بہنو!
مرے سینے میں تو دل کی جگہ پتھر دھڑکتا ہے
مرے حصے کے آنسو بھی، تمہارے نام نکلے ہیں
مری بہنو!
اس انداز سے روؤ، مگر کچھ زور سے روؤ
کہ اس ماتم کی آوازیں، مرے پتھرائے کانوں کو
نہ جانے کیوں بھلی معلوم دیتی ہیں
کوئی بتلائے، اس سینہ زنی، اس سینہ کوبی سے
مجھے کس نوع کی تسکین ملتی ہے
مرے سینے میں تو دل کی جگہ پتھر دھڑکتا ہے
تمہارے آنسوؤں کے ساتھ یہ دل بھی نہ بہہ جائے

لحد تیار ہے لیکن، ابھی کچھ دیر میرے گھر میں
بوڑھی برکتوں کا ابر رہنے دو
لحد تیار ہے، بیٹوں کی آنکھیں خشک ہیں،
لوگوں کو جلدی ہے
کہ میرے غم گسار اپنے بہت سے کام
ادھورے چھوڑ آئے ہیں
تمھی سوچو! جنازے کون تنہا لے کے قبرستان پہنچا ہے
مری بہنو!
تم اپنے سر، مرے سینے سے ٹکراؤ
کہ اس سینے میں بھی دل کی جگہ پتھر دھڑکتا ہے
مرے آقا!
مری ماں نے اذانوں کے جلو میں مجھ کو چھوڑا ہے
مرے آقا!
مری ماں مغربوں کے پالنے والے کا

شفقت ریز سایہ تھی
مرے آقا!
یہ بھی ہڈیاں اولاد کی چاہت کی چکی میں بڑی محنت
سے پس کر بھر بھری ٹھہریں
مرے آقا!
یہ بوڑھی انگلیاں راتوں کو سپنے کاڑھتی تھیں
تا کہ دن نکلے تو ان کے رنگ
میرے روپ میں تعبیر ہو پائیں
مرے آقا!
یہ آنکھیں صرف میری راہ تکتی تھیں
سبھی گلیاں مرے گھر کی طرف آتی تھیں
لیکن میں نہ آتا تھا
مرے آقا!
بھرے گھر میں، فقط یہ بوڑھی آنکھیں
میری آنکھیں تھیں
کفن کی سرسراہٹ تک پہ پوٹے کھول دیتی ہے
یہ آنکھیں بار بار اس طرح کھلتی ہیں
کہ گویا ان میں اب تک نور باقی ہے،
یہ مجھ کو دیکھ سکتی ہیں
مرے آقا!
یہ لب وہ پھول سے لب ہیں
کہ جو اپنی دعاؤں کی مہک کو روز اک بالکل نئی
لیکن سبق فرما کہانی کے بدن میں یوں بسا دیتے
کہ یہ خوشبو مرے کانوں کے رستے
جان و تن کے آخری تاریک گوشے تک پہنچ جاتی،
مرا ہر موئے تن یکسر معطر کر کے سو جاتی
کہ میں جب صبح دم اٹھوں
تو یہ خوشبو مرے دل کی مہک بن کر

مجھے مہکائے رکھے اور دن
نیکی بدی کے درمیاں باریک سے خط پر
بہت ہموار قدموں سے گزر جائے
مرے آقا!
یہ پھولوں سے بھی نازک ہاتھ میری ڈھال تھے
ان میں دعا کے رنگ کھلتے تھے،
یہ رنگ ان بوڑھے ہاتھوں سے دعا بن بن کے
اڑتے تھے
مرے آقا!
یہ خالی ہاتھ اک اللہ پر کامل توکل کی توانائی سے
اُٹھتے تھے
مرے آقا!
میں جو کچھ ہوں، مرے مولا کی رحمت، آپ کی الفت
اور اس کے بعد میری ماں کی محنت
اور شفقت کا نتیجہ ہے
مرے آقا!
مجھے رب دو عالم پر توکل،
آپ کے کردار کے سائے میں رہنے کی تمنا
اور انسانوں کی عزت اور دنیا میں فقط
محنت کے رستے آگے بڑھنے کے سبق،
مجھ تک مری ماں کے وسیلے سے ہی پہنچے ہیں
مرے آقا!
میں اپنے پالنے والے سے پہلے، آپ کے
باب شفاعت پر یہ بوڑھی ہڈیاں لے کر کھڑا ہوں
تاکہ میں اپنے وسیلے کے لیے اکمل شفاعت کی ضمانت
مانگ لوں
اور آپ کی اکمل شفاعت کے بھروسے پر
میں اپنے پالنے والے سے اپنی ماں کی خاطر
جنت الفردوس کا طالب بنوں
اپنے وسیلے کے لیے
رب محبت سے مکمل مغفرت چاہوں
مرے آقا!
اجازت دیں، لحد تیار ہے، لوگوں کو جلدی ہے
کہ مرے غم گسار اپنے بہت سے کام ادھورے
چھوڑ آئے ہیں
مرے آقا!
اجازت دیں، میں اپنی ماں کو مٹی میں ملا
دوں
آپ کو اپنے بہت پیارے چچا کا واسطہ ہے
حضرت حمزہؓ کی بے پایاں وفا کا واسطہ ہے
میرے آقا! مجھ کو مت دیکھیں کہ میں نے
اپنی بوڑھی ماں کی بوڑھی چھاتیوں سے خون
نچوڑا ہے
مگر مجھ کو اذانوں کے جلو میں اس نے چھوڑا ہے

.....

دوسری نظم "رحمان بابا کے لیے" میں خالد احمد ایک فلسفی شاعر نظر آتا ہے۔ اس میں فلسفہ زمان و مکان جاری و ساری ہے۔ قوموں کے عروج و زوال اور مکافات عمل کو تاریخی تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ خالد احمد کی شاعری اور تنقید پر مستند بات تو کوئی پڑا لکھا نقاد ہی کر سکتا ہے۔ میں تو ایک دوست کی حیثیت سے، ادب کے ایک عام قاری کے نقطہ نظر سے بات کی ہے اور
دنیا فقط گماں ہے، سب کچھ درون جاں ہے
جاگو ضرور خالد، آنکھیں مگر نہ کھولو

☆☆☆☆☆

اندوہ

وہ لڑکی صرف باتونی نہیں تھی ، کچھ زیادہ تھی کہ اس کی نرم قوسیں نرم ہونٹوں سے زیادہ گرم گفتاری کی عادی تھیں۔

مری آنکھیں گلابی جلد کی تہہ میں لہُو کی شہد آہٹ سُن رہی تھیں ، کان! چمکیلے بدن میں سرسراتی تیز، لرزہ خیز لہروں پہ لگ تھے لب دھڑکتے تن کی لرزش پہ جھکے تھے

لوگ کہتے ہیں: "تمہارے پاؤں سے بلّی بندھی ہے ، تم کہیں ٹِک ہی نہیں سکتے!" مجھے تکتے نہ تھکتی آنکھ روشن دان میں سے جھانکتے سورج پہ تھی ، بجھتے دیے کی ڈگمگاتی لو سے کچھ بڑھ کر لرزتی پنڈلیاں بارِ تنِ عریاں اٹھا سکنے سے عاجز تھیں ، مگر ، لرزاں لبوں پر رُوح کے پاتال میں اک زلزلے کی رو پہ تنکے کی طرح بہہ جانے والے شہر کا نوحہ نہ تھا ، بس آنے والے مرحلوں کے گیت تھے کچھ کوٹھیوں کے خواب تھے، کچھ زیوروں کے نام تھے

بے شک ! مری جیب اور اس کے پرس میں ہوٹل کا بل پورا نہ تھا - لیکن ، بس اک اصرار تھا!

"کل پھر ملیں گے!"

"ہاں"

"بہر صورت"

مرے بڑھتے ہوئے ہونٹوں پہ انگلی پھیر کر، منہ
موڑ کر بس یہ کہا تھا "سچ بتانا! کیا تمہیں بھی! اپنے استقبالیہ
بوسے میں وہ اندوہ ملتا ہے جسے یہ سوچ میں گم الوداعی مخملیں
بوسے کبھی چھو تک نہیں سکتے" مری آنکھیں گلابی جلد کی تہہ
میں لہو کی نرم آہٹ سن رہی تھیں! کان چمکیلے بدن میں گنگناتی
نرم لہریں گن رہے تھے! لب چھلکتے تن کی خواہش پر جھکے
تھے کون کہتا ہے مرے پیروں میں اک چکی بندھی ہے
میں کہیں ٹک ہی نہیں سکتا!

خالد احمد

رحمان باباؒ کے لیے

رہی گل گوں، جمالِ جسم کی ضو رات بھر
کھلی آنکھوں سے دیکھی پھوٹتی ہے، رات بھر
کئی شمعیں سرِ طاقِ شبستاں جل بجھیں
پڑی مدھم نہ میرے پیار کی لو، رات بھر

O

عروسِ مے بسِ پیراہنِ مینا رہی
مگر وجہِ نشاطِ دیدۂ بینا رہی
بربنہ چشمِ ناظر تھا، فرازِ طور پر
گرفتہ خواب، خاکِ وادیٔ سینا رہی

O

شرارِ عشق رُخ کو حُسن کا لپکا دیا
مرے مولا نے میرا غم مجھے لوٹا دیا
صراحی سے اُنڈیلیں برکتیں کس آن کی
پیالہ بھر دیا لیکن نشہ چھلکا دیا

O

وہ لب لعلیں، وہ دل خارا، وہ رُخ مرجان ہے
الگ کیونکر لگیں، اے جان! تینوں ایک ہیں

تہی دست و تہی داماں فقیروں کے لیے
یہ لعل و گوہر و مرجان، تینوں ایک ہیں

سپاہی کیا؟ سپہ سالار کیا؟ سلطان کیا؟
تہِ تیغِ اجل سامان، تینوں ایک ہیں

پڑے کس پر نظر، کشکول ٹھہرے کس کا سر
بریدہ تن سرِ میدان، تینوں ایک ہیں

تہی آواز کانوں، بے زبانوں کے لیے
بیاباں، شہر، گلستان، تینوں ایک ہیں

وہ باورچی ہو، ساقی ہو، سہِ یعقوب ہو
رہائی تک پسِ زندان، تینوں ایک ہیں

یہ تارا ہے کہ جگنو ہے کہ آنسو، کیا کہیں
کہ جھلمل میں، سرِ مژگان، تینوں ایک ہیں

صفِ اعدا، صفِ یاراں، صفِ نوحہ گراں
نگاہِ نم! نہ ہو حیران، تینوں ایک ہیں

شرابِ سرخ، مٹی کا کٹورا، خونِ دل
بہم ہو جائیں، تو اے جان! تینوں ایک ہیں

O

حدی خوانو! ہم آہنگِ جرس کچھ اور ہے
کہ زمزمہ گر، پسِ تارِ نفس کچھ اور ہے

ہوا کے کان پڑتی کیا؟ نوائے بے نوا
کہ شورِ ماتمِ خاشاک و خس کچھ اور ہے

پلٹ جا ڈھیر کر کے دولتِ اشک و ہنر
نگاہ نکتہ رس! وہ نکتہ رس کچھ اور ہے

مہِ شہرِ نگاراں! روئے یارِ مہرباں!
غمِ آسمانوں کو سامانِ ہوس کچھ اور ہے

وہ رُخ نکھرا نہ تھا داؤدؑ کے مزمور کا
کہ میرے شہدلب کا رنگ رس کچھ اور ہے

در بے در پہ دیتے کیا دُعا کی دستکیں
کہ درویشوں کے زیرِ دسترس کچھ اور ہے

لہو جلتا رہا کرب و بلا کے طاق میں
چراغ خانۂ آفاق رس کچھ اور ہے

قبا پر سلوٹیں ہیں اور تن پر جھرّیاں
سرِ کاغذ بھی غم اب کے برس کچھ اور ہے

O

ترا ہر نقشِ فن، عرشِ سخن کا چاند ہے
مرا سورج، ترے تاروں کے آگے ماند ہے
رگِ الفاظ میں چلتا لہو، جمتا نہیں
ترا اِک اِک سخن، تیرے لہو کی ناند ہے

O

تنِ خاکی پہ کیا مٹی کے ذرّے تاڑنا
سرِ انگشتِ حنا سے خاک تن کیا جھاڑنا
شکستہ جاں، شکستہ پا، شکستہ پیرہن
لباسِ تار پر کیا بیل بوٹے کاڑھنا

O

ترا مہ فام مٹی میں ملایا جائے گا
یہ گل اندام مٹی میں ملایا جائے گا
اسی مٹی سے پھوٹیں گی تری نم نکہتیں
کہ اِس کا نام مٹی میں ملایا جائے گا

O

سزاوارانِ بارانِ ندامت کیا کریں؟
طلبگارانِ خورشیدِ قیامت کیا کریں؟
لوائے فقرِ احمدؐ ہاتھ سے رکھ دیں، مگر
سحر دم، گل چراغِ استقامت کیا کریں

O

دُکھوں کی ڈار سے بچھڑی ہوئی اک کونج ہے
یہ مجموعہ تری گرلاہٹوں کی گونج ہے

خالد احمد

غزل

مُو قلم حلقۂ زنجیر کہاں ہوتے ہیں
نقش تجھ سے سرِ تصویر کہاں ہوتے ہیں

شہر کی دُھول سمٹ آئی ہے کیوں آنکھوں میں
کچھ تو کہہ اب ترے دلگیر کہاں ہوتے ہیں

سر کو گھٹنوں پہ دھرے کون کبھی بیٹھا تھا
ہم سے وحشی یونہی زنجیر کہاں ہوتے ہیں

وہ نگر جس کو جگہ دے نہ خیالوں کی زمیں
وہ حقیقت میں بھی تعمیر کہاں ہوتے ہیں

لفظ مفہوم کی تنہائی کے عریاں قیدی
لفظ منت کشِ تفسیر کہاں ہوتے ہیں

خواب تو دیکھنے والوں کے ہنر ہیں خالد
خواب خود در پے تعبیر کہاں ہوتے ہیں

خالد احمد

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

آنکھ کب جھپکے گی، بکھرے گی یہ زنجیر کہاں
اے مرے خواب رواں! ہے تری تعبیر کہاں

غزل [نذرِ خالد احمد]

بہم جتنا جسے فیضان رکھنا
ہمیں بھی یاد اس دوران رکھنا

ہجومِ خلق میں رہتے ہوئے بھی
الگ اپنے لیے پہچان رکھنا

جدا ہونا بھی مجبوری ہے لیکن
کہیں ملنے کا بھی امکان رکھنا

مراحل عشق میں اتنے کڑے ہیں
بہت دشوار ہے آسان رکھنا

خداوندا یہی توفیق مانگوں
مقابل حسن کے حیران رکھنا

دروغ و کذب کے ادوار میں بھی
نمایاں راستی ہر آن رکھنا

پریشاں حال خلقت کو نہ روکے
کسی ہمدرد کو دربان رکھنا

بچانا خود کو اسکے جور سے بھی
جسے شرمندۂ احسان رکھنا

بہت سے لوگ دانائی سے الجھے
مرے مولا مجھے نادان رکھنا

گلزار بخاری

ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے

بیٹا میں تمھاری پسند کی شادی نہیں کروں گی۔ اس لڑکی نے ہمارے گھر کی ایک ایک اینٹ بیچ دینی ہے۔ میرا ایک ہی ہونہار بیٹا ہے۔ جو اس لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے بلکہ سارے رشتے دار آنکھ لگائے بیٹھے ہیں۔ تمھاری پرموشن کا سن کر ہر کوئی رشتہ دینے کے لیے تیار ہے۔

میری سہیلی رقیہ نے رشتہ ڈالتے وقت اتنی لمبی لسٹ..... میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

خالی لڑکی نہیں..... ثریا غور سے دیکھو۔ اس لسٹ کے مطابق چیزیں بھی آئیں گی۔ راشد کی ماں نے وہ لسٹ لے کر چیزوں کی گنتی کی، تو ہوش اُڑ گئے۔ لاتعداد چیزیں..... ثریا کو کسی قسم کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ ہر چیز..... نئی اور برینڈڈ تھی۔ وہ تو رشتہ ڈال کر لسٹ ثریا کے حوالے کر کے چلی گئی، مگر ثریا کو چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بیٹے سے مخاطب تھی۔ قسمت والوں کو ایسی چیزیں نصیب ہوتی ہیں۔ دیکھو تو ذرا میں نے تو خوابوں میں بھی ایسی چیزیں نہیں دیکھی۔

''امی''

راشد نے مغموم لہجے سے کہا..... میں اپنے محکمے کی لڑکی، جو میرے ساتھ کام کرتی ہے۔ اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ نہایت ہی سلجھی ہوئی ہونہار اور سب کولیگز سے لائیک لڑکی ہے۔

دیکھو بیٹا..... ابھی دو بیٹیوں کی شادی کر کے پھر بہو لاؤں گی۔ ویسے بھی اپنی سہیلی رقیہ کی بیٹی نورین سے شادی کروں گی۔

لیکن امی میں نے بھی شمع کے ساتھ وعدہ کر لیا ہے۔

''اور کیا دینگے وہ''

دینا کیا ہے..... بیٹی اپنی ہمیں سونپ دیں گے ہم نے ان سے اور کیا لینا ہے۔

''اس کا مطلب ہے..... وہ کنگال لوگ ہیں''

بلقیس ریاض

"نہیں..... علم کی دولت سے مالا مال ہیں۔ آپ اجازت دیں گی تو شادی کے لیے وہ راضی ہو جائیں گے۔ روشن خیال ہیں۔"

"اگر نہ دوں تو"

"تو مجھے کورٹ میرج کرنی پڑے گی"

"مجھے معلوم ہے..... کہ ڈرانے دھمکانے سے میں راضی ہو جاؤں..... نہیں۔ ہرگز نہیں۔ جانتے ہو، جو کپڑا اور زیور تمہارے سسرال سے آئے گا وہ میں اپنی بیٹیوں کو دے کر رخصت کروں گی۔ رقیہ کی بیٹی سے شادی کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔"

"امی..... بغیر لڑکی کو دیکھے بھالے۔ چیزیں دیکھ کر شادی کر دینگی۔"

ہاں دنیا کا یہی دستور ہے۔ تمہارا باپ صرف یہ گھر سونپ کر بچوں کی ذمہ داریاں مجھ پر ڈال کر چلتا بنا اور میں نے کتنی مشکلات کا سامنا کیا ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہے۔ تم میرے بڑے بیٹے ہو۔

"اچھا..... میں مزید بحث نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن رقیہ آنٹی کی بیٹی کے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ کیا خبر وہ کیسی ہو۔ پھر۔ شمع ایک سلجھے ہوئے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ آپ کو کبھی مایوس نہیں کرے گی۔"

"اور بیٹیوں کے جہیز کون دے گا۔"

"وہ جہیز کیوں دینے لگے..... بہنوں کے لیے ہم نے خود سوچنا ہے۔"

کہاں سے..... کیا اڑن کھٹولے سے آسمانی فرشتہ آنگن میں جہیزوں کے سامان رکھ جائے گا۔"

"امی"

جہیز جہیز کی رٹ لگائی ہے۔ آپ شمع کو ایک نظر دیکھ ہی لیں۔ شاید آپ کا دل پسیج جائے۔ میں بغیر دیکھے ہی کہتی ہوں۔ دکھوں نے میرا سینہ پتھر کا کر دیا ہے۔ اور جانتے ہو۔ پتھر کبھی پگھلتا نہیں ہے۔ تو..... کیا..... ہیں.....

"ہاں..... جیسے اس سے اقرار کیا تھا انکار بھی کر دو۔"

امی میں ہمارے گھر کی بھلائی ہے۔

امی میں ایک جیتا جاگتا انسان ہوں۔ میرے سینے میں بھی ایک دل دھڑکتا ہے۔ عمر کے اس حصے میں ہوں کہ اپنے اچھے برے کی تمیز کر سکتا ہوں۔ اس وقت ابا کے بعد میں ہی اس گھر کا کفیل ہوں۔ اور میری خواہش کا احترام کریں۔ خدا خدا کر کے تمہاری تنخواہ بڑھی ہے۔ ورنہ کتنی مشکلوں سے تم لوگوں کو پالا پوسا ہے۔ اس بات کو نظر انداز کر چکے ہو۔ جبکہ رشتے داروں نے بھی منہ موڑ لیے تھے۔ واحد میں تھی جو اس بھری دنیا میں اکیلی مشکلات کا سامنا کرتی رہی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم ایسا قدم کبھی نہیں اٹھاؤ گے..... ورنہ۔

"ورنہ کیا"

یہ بعد میں بتاؤں گی..... اگر لے کر آئے تو کھڑے کھڑے اسے گھر سے نکال

دوں گی۔
کاش امی آپ پڑھی لکھی ہوتیں تو اس طرح کی باتیں نہ کرتیں۔
ٹھیک ہے میں پڑھی لکھی نہیں، مگر اپنے بچوں کو علم سے روشناس کروایا ہے۔
"پھر..... یہ بھی سوچیں..... ہم کیا چاہتے ہیں۔ ہماری بہنوں کی شادی ہوگی تو اتنی بڑی لسٹ بنا کر ان کی ہتھیلی میں رکھیں گی۔"
میں لسٹ کیوں بنانے لگی وہ چاہت سے رشتہ ڈال کر میری بیٹیوں سے شادی کریں گے۔
اگر سسرال نے کوئی ڈیمانڈ کی تو پھر کیا کریں گی۔
اس لیے تو اچھے گھر سے رشتہ جوڑنا چاہتی ہوں۔ تاکہ بہو کے جہیز سے ہی ان کے لیے چیزیں نکل آئیں۔ دوسروں کی بیساکھی پر چلنے والے لوگ بڑے ہی گھاٹے میں رہتے ہیں۔
"تم جو مرضی کہو..... میری طرف سے انکار ہے۔"
"یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے۔"
بالکل سو فیصد آخری..... اب تکرار کرنے کی ضرورت نہیں مجھے بتاؤ کس دن رقیہ کے گھر جانا ہے۔
وہ غصے سے دروازہ پٹختے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔
ثریا آنسو بہاتی رہی، تو بڑی بیٹی نے ماں سے کہا۔
"امی مان جائیں..... راشد بھائی غصے سے گئے ہیں۔ شادی اگر کرلی تو کیا کریں گی۔"
ارے ایسے ہی کر لے گا..... دوسرے دن ہی میں اسے طلاق دلوا دوں گی۔" بیٹی خاموش ہوگئی۔ شام کے وقت راشد کا فون آگیا۔
"امی..... میں شمع کے ساتھ کورٹ میرج کر رہا ہوں۔ آپ بھی پہنچ جائیں۔ شمع کے والدین بھی شامل ہیں اور آپ کی شمولیت بہت ضروری ہے۔"
"ارے نادان لڑکے..... جو دل میں آتا ہے کر۔ میں آنے والی نہیں مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے۔ کورٹ میرج نہیں کر سکتے۔ یہ ڈراوے کسی اور کو دینا..... اور ثریا نے فون بند کر دیا۔
دو گھنٹے بعد راشد گھر میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ معصوم سی بھولی بھالی سی..... اور نہایت ہی نازک لڑکی اس کے ساتھ تھی۔
ثریا نے اس کی جانب دیکھا۔
دیکھتے ہوئے کہا۔
"یہ لڑکی..... ایک کنگال گھرانے کی۔ اس کے لیے ماں کے ساتھ الجھتے رہے ہو۔ وہ غصے سے ایک شیرنی کی طرح دھاڑی..... دفعہ ہو جاؤ۔ میں تمہیں اپنی بہو تسلیم نہیں کرتی۔"
وہ کھڑے کھڑے لڑکھڑا گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ ثریا..... اس وقت چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا رہی تھیں۔ شمع کا نازک

دل دہل گیا۔ غیر شعوری طور پر اس کے پاؤں کانپنے لگے۔ پیشانی پر ان گنت سلوٹیں پڑنے لگیں۔ چہرہ پیلا پھک تھا۔ کسی نے بیٹھنے کے لیے نہ کہا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس گھر میں پہلے دن اس طرح کا استقبال ہوگا۔ مسلسل ان لوگوں کو حیرت سے دیکھتی رہی۔ اور ثریا کو محسوس ہونے لگا۔ جس تخت پر وہ بیٹھی تھی وہ اس کے پاؤں سے کھسک گیا ہے۔ اور ہر چیز۔ اس کا تمسخر اڑا رہی تھی۔ سکتہ میں آنا ہی چاہتی تھی کہ پھر دھاڑی۔ اگر ماں کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو اس کو ابھی اور اسی وقت طلاق دو۔

"طلاق"

"ہاں"

"لیکن میں نے طلاق دینے کے لیے اس کے ساتھ شادی نہیں کی۔" دل سے اپنی بیوی تسلیم کیا ہے۔ ارے یہ ایک دفتر میں کام کرنے والی کنگال لڑکی ہے۔ ایک جوڑا تک اپنے ہمراہ نہیں لائی۔ اس گھر میں اس کی کیا عزت ہو سکتی ہے۔

جوڑا نہیں لائی..... تو جوڑے بھی آپ کو مل جائیں گے۔ میں کل اس کی شکل دیکھنا گوارہ نہیں کروں گی۔ اس کو اس گھر میں مت لانا۔

"بہت بہتر"..... پھر وہ شمع کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گیا۔

ثریا..... پریشان سی اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

باہر گہرے بادل چھائے تھے۔ اس فضاؤں میں اداسی اور تاریکی رچی تھی۔ سارا گھر اس وقت سنسان دکھائی دے رہا تھا۔ نہ جانے رات کے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ اور سوتے وقت مصمم ارادہ کر چکی تھی کہ صبح اس کو طلاق دلوا کر بیٹے سے صلح کر لے گی۔

صبح حسب معمول دونوں جاگ گئے۔ اور جلدی جلدی دفتر جانے کے لیے شمع نے اپنے ساتھ دو جوڑے لے کر آئی تھی۔ ایک رات کے لیے اور دوسرا صبح دفتر جانے کے لیے وہ دونوں تیار ہو کر باہر آئے۔ ناشتہ کی میز خالی نظر آئی۔ تو دونوں نے ماں کو سلام کیا۔ سوچا کہ ناشتے کے لیے انھوں نے بندوبست کیا ہوگا۔ مگر انھوں نے شمع کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ وہ شمع کا ہاتھ پکڑ کر باہر پورچ کی طرف جانے لگا۔ تو ماں کی پیچھے سے آواز گونجی۔ "اے لڑکی"۔ جہاں سے آئی ہو وہیں چلی جاؤ۔ اس گھر میں تمھارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

وہ مڑی..... اور کہا۔

"آنٹی آپ بے فکر رہیں..... ایک رات میں میں نے بہت بڑا آگ کا دریا عبور کیا ہے آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔"

وہ دونوں دفتر پہنچ گئے۔

ابھی دو گھنٹے ہی گزرے تھے..... کہ ایک سامان سے بھرا ٹرک پورچ میں آن کھڑا ہوا..... دو چار لوگ اُتر کر سامان پورچ پر رکھنے لگے۔ ثریا بیگم جھٹ سے باہر نکلیں، تو

حیرت میں گم ہو گئیں۔ دنیا کی کوئی ایسی نایاب چیز نہیں تھی، جو اس سامان کے اندر موجود نہ ہو۔ وہ پوچھنے لگی۔

"یہ کیا ہے۔"

یہ شمع بی بی کا جہیز ہے۔ ایک ٹرک اس گھر کے لیے اور دوسرا اس طرح کا سامان ان کے اپنے گھر کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔ اپنے گھر..... اس شخص نے جواب دیا۔

ان کے والدین نے ڈیفنس میں گھر دیا ہے اور گاڑی بھی۔ دفتر کے بعد وہ اپنے گھر جائیں گی۔ اور راشد۔

جی وہ بھی ساتھ ہی جائیں گے سامان بہت زیادہ ہے اپنی نگرانی میں لگوائیں گے۔

ثریا بیگم ..... کے اوسان خطا ہو گئے.....

اندر جا کر بیٹے کو فون کیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔"

"کیا"

"یہ سامان"

"امی یہ سامان آپ کی بیٹیوں کے جہیز کے لیے جا رہا ہے تھا۔ آپ کی خواہش کے مطابق آپ کو چیزیں مل گئی ہیں۔ اتنی امیر باپ کی بیٹی ہے اور اتنے پڑھے لکھے لوگ ہیں انھوں نے اپنی بیٹی پر اعتماد کرتے ہوئے مجھ جیسے متوسط گھر کے لڑکے کو داماد بنانا قبول کر لیا۔ وہ بہت اعلیٰ سٹیٹس کے لوگ ہیں۔ علم، دولت، شہرت اور ہر چیز کے مالک ہیں۔ وہ بھی چاہتے تو اونچے گھرانے میں اپنی بیٹی کا رشتہ کر سکتے تھے مگر وہ اپنی بیٹی سے محبت کرتے ہیں اسی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے بخوشی اس کی شادی میرے ساتھ کر دی..... تو کیا آپ اپنے بیٹے سے محبت نہیں کرتیں۔ دعویٰ تو آپ بہت کرتی تھیں کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے مجھے اس سے محبت ہے تو کہاں گئی وہ محبت..... کیا آپ میری خاطر اس لڑکی کو اپنی بہو تسلیم کر لیتی تو میں سمجھتا میری ماں مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔ ہم اپنے گھر میں رہیں گے۔ فکر کی کوئی بات نہیں آپ کو ماہانہ ملتا رہے گا۔ خدا حافظ۔

فون بند ہو چکا تھا..... ثریا کے ماتھے پر سرد موسم ہونے کے باوجود پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ ٹرک سے چیزیں وہ لوگ اتار اتار کر گھر کے خالی کمروں میں رکھ رہے تھے۔ ثریا کو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا..... آنکھوں میں شدید غم و غصہ سے آنسو لگاتار بہہ رہے تھے۔ سامان میں سب کچھ تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کی ساری خوشیاں کوئی چھین کر لے گیا ہو اور وہ تہارہ گئی ہو۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ فضا میں اداسی چھائی تھی۔ چیزوں میں سب کچھ موجود تھا، مگر اس کے گھر کا انمول ہیرا کوئی چھین کر لے گیا تھا۔ سامنے ٹی وی پر میڈم نور جہاں کا گانا چل رہا تھا۔

ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے
کی لب نی اے وچ بازار کڑے

☆☆☆☆☆

گہرا سمندر

نیلم احمد بشیر

میرے بیٹے علی نے ہمیشہ کی طرح اپنا سکول بیگ شاپ کے ایک کونے میں پھینکا اور سٹول کھینچ کر میرے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے بھی اپنا معمول کا سوال دہرایا۔

”کھانا کھا لیا تھا؟“

حقیقت یہی ہے کہ ہر ماں اپنے بچے کے کھانے پینے کے بارے میں ہمیشہ متجسس اور فکرمند رہتی ہے۔ چاہے بچہ جتنا مرضی صحت مند اور ہٹا کٹا ہی کیوں نہ ہو؟ اب بچہ رہا بھی نہ رہ گیا ہو مگر اسے ہمیشہ یہی لگتا ہے کہ اس کے بچے نے ٹھیک سے کھایا نہیں ہوگا، بھوکا ہی ہوگا۔

”ڈونٹ وری مام...! میں نے سکول میں لنچ کر لیا تھا اور اچھی طرح خوب پیٹ بھر کے کھایا تھا۔“

علی روز مجھے مسکرا کر یہی جواب دیتا تو میں مطمئن ہو کر اپنی شاپ کے کسٹمرز کو اٹینڈ کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ جب تک میں شاپ میں رہتی، علی اس بڑے سے وہائٹ مارش شاپنگ مال میں ہی گھومتا پھرتا رہتا۔ کبھی کبھار اپنا سکول کا ہوم ورک بھی کسی بینچ پر بیٹھ کر ہی مکمل کر لیتا۔ کبھی اس سٹور کبھی اس سٹور گھومتا، سیکیورٹی گارڈز سے ہیلو ہائے کرتا، سٹور مالکان اور ملازمین سے گپیں لڑاتا، وقت گزار لیتا تھا۔

سب اس سے بہت مانوس ہو گئے تھے اور اس کی موجودگی کے عادی بھی۔ اگر کبھی ایک آدھ دن وہ ان کی طرف نہ جا پاتا تو سب مجھ سے پوچھنے چلے آتے کہ "علی کہاں ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے؟ نظر کیوں نہیں آ رہا؟"

کوئی کہتا "میں نے اس کے لئے چاکلیٹ کیک کا ایک پیس بچایا ہوا ہے۔"

کوئی کہتا: "اسے کہنا آ کر فریش لیمونیڈ پی لے۔" تو کوئی اس کے لئے یونہی کوئی گفٹ چھوڑ جاتا۔

شاپنگ مال سٹورز والے گورے، کالے، چینی، انڈین، پاکستانی، امریکن اب کتنے ہی سالوں سے ہماری فیملی کی طرح بن گئے تھے اور علی سے تو خاص طور پر بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔ علی سکول میں بہت اچھے گریڈز لیتا تھا، جس کی وجہ سے سب بہت خوش ہوتے، اسے تھپکی دیتے اور اس کی کارکردگی کو سراہتے رہتے تھے۔

گوڈائیو چاکلیٹ سٹور پر کام کرنے والا بوڑھا نیلسن تو خاص طور پر علی سے بہت پیار کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں اور علی کے ابو اسے ہنس کر کہتے:

"تم تو علی کے نانا اور دادا کی جگہ لے رہے ہو۔" تو وہ بڑا خوش ہوتا۔ علی بھی اسے گرینڈ پا کہہ کر بلاتا۔ مجھے البتہ اپنے دل کی گہرائی میں افسوس کی ایک لہر کروٹ لیتی محسوس ہوتی کہ علی کے نانا اور دادا اس سے اتنی دور تھے۔ وہ اسے یوں بڑھتے، پھلتے پھولتے، زندگی میں آگے کی طرف بڑھتے ہوئے نہ دیکھ سکتے تھے۔ وطن سے دور رہنے والوں کے ساتھ ایسا تو ہوتا ہے۔

ہم لوگ قریباً پندرہ سال سے امریکہ میں رہائش پذیر اور ہر لحاظ سے سیٹ ہیں۔ یہاں کے اچھے نظام اور سکھ چین دیکھ کر کئی بار دل میں حسرت جاگتی ہے کہ کاش ہمارے اپنے پیارے پاکستان میں بھی سب اسی طرف سے زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ہمارا وطن بھی اتنا ہی پرابلم فری ہو جائے مگر ہمارے حکمران تو ایک کے بعد ایک آتے ہیں، ملک کے وسائل اور دولت، اختیارات کو لوٹتے ہیں تو ان سے کسی بہتر نتیجے کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟

امریکہ میں رہنے والے بچوں کا ایک مسئلہ ہوتا ہے، وہ جھوٹ اور منافقت کے گر سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ ہمارا علی بھی ایسا ہی ہے۔ میں اور اس کے ابو دو تین سال بعد وطن عزیز کا ایک چکر لگاتے ہیں تو وہ بھی ہمراہ ہوتا ہے مگر پاکستان کو زوال پذیر دیکھ کر حیران پریشان ہو جاتا ہے۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ملک آخر ایسا کیوں ہے اور امریکہ کی طرح کیوں نہیں ہے؟ علی سچ کہنے سے بالکل بھی نہیں ڈرتا اور جہاں موقع ملے تنقید شروع کر دیتا ہے۔

ابھی دو سال پہلے ہی کی تو بات ہے۔ ہم لوگ پاکستان گئے ہوئے تھے، رشتہ داروں، دوستوں سے میل ملاقات میں مصروف تھے۔ بڑے بھیا نے جن کا تعلق ایک پرانی سیاسی پارٹی سے ہے، ہمیں اپنے

ایک جلسے میں شرکت کی دعوت دی۔ یہ پارٹی ایک زمانے میں اپنے انقلابی منشور اور متحرک قائدین کی وجہ سے بہت مقبول تھی مگر گزرتے وقت کے ساتھ اس کے لالچی، خود غرض عہدیداروں نے ایسی خباثت بھری کرپشن کی کہ عوام کا ان پر سے اعتماد جاتا رہا۔ الیکشن کے قریب آتے ہی پارٹی پھر برسر اقتدار رہنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور یہ جلسہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ ہم سب تو اس پارٹی کی نیک نیتی کے بارے میں کافی مشکوک تھے مگر بھیا کو شاید اب بھی امید تھی جو مسلسل ان بجھے ہوئے چراغوں کے دھوئیں کو روشنی کی پرچھائیں سمجھنے کی خوش فہمی میں گرفتار تھے۔

ان کے جلسے میں خوب زور و شور سے تقریریں ہو رہی تھی۔ پاکستان کو ایک بہتر ملک بنانے کے لئے منصوبے بنائے جا رہے تھے کہ یکدم کسی نے کہا:

"ینگ بلڈ کو آگے آنا چاہئے۔ نئی جنریشن کی رائے معلوم کرنی چاہئے کہ وہ اس ملک کے لئے کیا اور کیسا سوچتے ہیں؟" وغیرہ وغیرہ

چند نوجوان لڑکے سٹیج پر آئے اور پرجوش تقریروں اور جذباتی نعروں سے پنڈال کو گرما دیا۔ یکا یک بھیا کو کچھ خیال آیا۔ انہوں نے علی کی طرف دیکھ کر اعلان کیا:

"اتفاق سے میرا نوجوان اور فیورٹ بھانجا علی اس وقت یہاں موجود ہے۔ یہ امریکہ میں رہتا ہے مگر آج کل پاکستان کا مہمان ہے اور آخر کیوں نہ ہو بھئی پاکستان میں اس کے باپ دادا کی جڑیں ہیں۔ میں علی کو اظہار خیال کی دعوت دیتا ہوں۔ وہ آئے اور ہمیں بتائے کہ آج ہمارا ملک کہاں کھڑا ہے اور ہمیں کس سمت جانا چاہئے؟" یہ سنتے ہی علی نے فوراً میری طرف دیکھا، مثبت اشارہ دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور سٹیج پہ جا کے مائیک تھام لیا۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے گھاگ سیاستدان اس میدان کے پرانے کھلاڑی مزید چوڑے ہو کر کرسیوں پر پھیلنے لگے۔

"ہیلو اینڈ السلام علیکم...!" علی نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔

"میں ایک امریکن پاکستانی ہوں اور ایری زونا سٹیٹ میں ایک سرکاری سکول میں زیر تعلیم ہوں۔ اس کے علاوہ میں اپنی پاکستانی کمیونٹی کی پاکستان ایسوسی ایشن کا بھی اہم رکن ہوں۔ میں نے آپ سب کی تقریریں سنی ہیں اور میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ آپ سب لوگ منافق اور جھوٹے ہیں۔ آپ صرف اپنے فائدے کی ہی بات کر رہے ہیں۔ ملک کی وسیع تر مفاد سے آپ کو قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

علی کے منہ سے یہ باتیں سنتے ہی مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ چاروں طرف ایک سناٹا سا چھا گیا۔ ایک لمحے کو تو میں بھی دل ہی دل میں کانپ کے رہ گئی۔

"یا الٰہی خیر...! یہ امریکن بچہ کہیں مزید اول فول نہ بک دے۔" میں نے گھبرا کر سوچا۔

علی مکمل اعتماد سے بولتا چلا گیا۔

”ہم امریکہ میں رہتے ہیں، جہاں معاشرے کی بنیاد ہی دیانتداری اور نظم و ضبط پر ہے۔ لوگ اپنے ملک کے ساتھ مخلص ہیں جبکہ پاکستان میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہاں حکمرانوں کو محض اپنی جھولیاں بھرنے کی پڑی رہتی ہے اور لوگ بھوکے، ننگے، کام چور اور آسانیاں تلاش کرنے والی قوم بن چکے ہیں۔ یہاں قانون کی بالادستی نہیں اور ہر ادارہ زمین بوس ہو چکا ہے۔ آئی ایم سوری مگر آپ لوگوں کو پہلے اصول پرستی، فراخدلی اور تعمیری سوچ اپنانا ہوگی۔ وہاں ہر ایک کو اس کا حق ملتا ہے۔ کوئی کسی کا حق نہیں مارتا۔ فیصلے سفارشوں پر نہیں، میرٹ پہ ہوتے ہیں۔ آپ لوگوں کو پہلے اپنا ذاتی اور قومی کردار ٹھیک کرنا ہوگا۔ یہ ملک تبھی ترقی کرے گا اور دنیا کی مہذب قوموں کو شانہ بشانہ چل سکے گا۔ ان خالی خولی تقریروں کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ لوگ تکلیف نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔“

یہ سب کہہ کر علی چپکے سے نپے تلے قدم اٹھاتا سٹیج سے نیچے اتر آیا اور مجمع میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا، میں خوش تھی یا شرمندہ؟ پھر چند ہی لمحوں بعد بھیا نے صورتحال کو سنبھال لیا۔ علی کی کمر تھپتھپاتے ہوئے بولے:

”یہ نوجوان بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ میں خوش ہوں کہ میرا امریکہ سے آیا ہوا نوجوان بھانجا سچ بولنے کی صلاحیت اور جرأت رکھتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرے ملک کا ہر نوجوان ایسی سوچ اپنائے، تبھی اس ملک کے مقدر کا ستارہ چمکے گا۔“

بھائی جان کی یہ بات سن کر میں نے سکھ کا سانس لیا اور ہولے سے مسکرا دی۔ میں جانتی تھی کہ میرا بیٹا کہتا تو سچ ہے مگر پھر سچ سننے کا حوصلہ پاکستان کی سیاسی پارٹیوں یا حکمرانوں میں ہوتا ہی کہاں ہے؟

”ڈیئر کزن... اشکر کر تجھے ابو کی باتوں سے بچا لیا ورنہ یہاں کوئی ایسی بات کرے تو اسے جوتے اور ٹماٹر پڑتے ہیں۔“

بھائی جان کے ٹین ایج بیٹے ارسلان نے علی کے کندھے کو ہولے سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ میں اور علی کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

وہائٹ مارش شاپنگ مال میں ہمارے سٹور کو چلتے اب بہت سے سال بیت گئے ہیں۔ ہم معاشی طور پر کافی مستحکم ہو چکے ہیں۔ علی بھی تعلیم کے میدان میں منزلیں مارتا ماشاءاللہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اب تو اس نے سکول کے ایف ایم ریڈیو سٹیشن پر بطور کمپیئر کام بھی شروع کر دیا ہے۔ اسے میوزک پلے کرتے اور اعتماد سے گفتگو کرتے سن کر ہم بہت خوش ہوتے ہیں کہ ہمارا بچہ امریکہ میں ہر طرح سے اپنی تخلیقی اور تعلیمی صلاحیتوں کا اظہار کرنے کے مواقع حاصل کر رہا ہے اور اسے کسی بھی طرح سے پیچھے نہیں رہنا پڑتا۔ اس کا جو جی چاہتا ہے وہ کر سکتا ہے اور ہاں

باپ کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات بھلا کیا ہو سکتی ہے؟

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ حال ہی میں ایک واقعہ وقوع پزیر ہوا۔ پوری دنیا یہ خبر سن کر دنگ رہ گئی کہ امریکی فوجیوں نے رات کی خاموشی میں چپکے سے ایک خفیہ آپریشن کیا اور ایبٹ آباد میں مقیم اسامہ بن لادن اور اس کے اہل خانہ کو ٹارگٹ کر کے مار دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ امریکی میڈیا نے اسامہ، اس کے بیوی بچوں، ملازمین وغیرہ کسی کو بھی ٹی وی پر دکھایا نہ ان کے بیانات سنوائے۔ آج کے میڈیا awareness دور میں یہ بڑی اچنبھے کی بات ہے۔ آج تو دنیا کے کسی کونے میں کوئی مکھی یا مچھر بھی مر جائے تو کیمرے کی آنکھ اسے فوراً محفوظ کر لیتی ہے اور میڈیا پر نشر کر دیتی ہے۔ امریکہ کا دشمن جان مارا جائے اور کیمرہ کچھ بھی نہ دکھائے؟ اس سے شکوک و شبہات اور ابہام تو ضرور پیدا ہوتے ہیں مگر امریکیوں کو تو جاب ویلڈن ہونے کا اطمینان اور سکون چاہئے تھا، لہٰذا وہ اسامہ کی ہلاکت اور سمندر بوس ہونے کی خبر سنتے ہی خوشی سے جھوم اٹھے اور ناچتے ناچتے سڑکوں پر نکل آئے۔ اسامہ کے خاتمے کا رقص مناتے، وہ ایک دوسرے کو مبارکبادیں دے رہے تھے اور جئے امریکہ کی ٹی شرٹس پہنے خوب اترا رہے تھے۔

علی بھی بہت خوش تھا۔ بار بار کہہ رہا تھا:

"دیکھا مام ڈیڈ...! آخر امریکہ نے دنیا کے سب سے بڑے دہشت گرد کا خاتمہ کر ہی دیا ناں؟ واٹ اے گریٹ کنٹری۔ امریکہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اب ساری دنیا میں امن چین ہو جائے گا۔ شکر ہے آپ لوگ امریکہ چلے آئے اور میں یہاں پیدا ہوا۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور ٹی وی پہ سی این این کی خبریں دیکھنے لگے۔

اگلا روز امریکیوں کے لئے کرسمس سے بڑھ کر خوشی کا دن تھا۔ ہر طرف سیلی بریشن جاری تھی۔ آفٹر سکول ایکٹی ویٹیز میں اس روز علی کا ایف ایم ریڈیو پروگرام بھی تھا جس پہ علی نے تازہ ترین صورتحال اور خبروں کو موضوع بنایا اور بار بار خوش ہو کر اعلان کیا:

"we got him" (ہم نے اسے پکڑ لیا۔)۔ ایکسائٹمنٹ کے مارے اس سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے کتنے ہی خوشیوں کے نغمے پلے کئے اور جوکس سنائے۔ پروگرام بہت خوشگوار ماحول میں چلتا رہا۔ اتنی کالز آئیں کہ ٹیلی فون کی لائنیں جام ہو کر رہ گئیں۔

کوئی امریکی فوجیوں کی شجاعت، کوئی ملٹری سٹریٹیجی، کوئی پاکستانی حکومت کی نالائقی بیان کر رہا تھا اور کوئی کہہ رہا تھا کہ پاکستان ایک جھوٹا ملک ہے، اتنے بڑے دہشت گرد کو چھپا رکھا تھا اور ہم سے امداد بھی بٹورے جا رہا تھا۔

رات کے کھانے کی میز پر علی ہمیں یہ سب بتا رہا تھا مگر میں اور علی کے ابو کچھ چپ چپ سے تھے۔ ہمیں اس روز پہلی بار احساس ہوا کہ

ہمارے گھر میں ایک امریکن رہتا ہے۔ ایسا جس کی سوچ ہماری سوچ سے جدا ہے اور جس کے نظریات ان ہی حقائق پر مبنی ہیں جنہیں امریکی میڈیا اپنے عوام کو سپون فیڈ کرتا ہے۔ ہم تیسری دنیا کے تارکین وطن، ہماری کیا مجال کہ ہم آقاؤں کی پالیسیوں، ترجیحات اور حتمی فیصلوں کے آگے کچھ کہہ سکیں۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنے آلو گوشت اور چپاتی کو سامنے رکھے اجنبی نظروں سے علی کی طرف دیکھتے رہے اور علی اپنی سٹیک اور بیک پوٹیٹو کی پلیٹ ہاتھ میں لئے خبریں دیکھنے میں مصروف رہا۔

فاکس چینل پہ مشہور ٹاک شو ہوسٹ Greta Van اپنا ٹیڑھا منہ گول گول گھما کر ہمیشہ کی طرح مسلمانوں کو لعن طعن اور گوروں کو دنیا کی مہذب ترین قوم قرار دے کر اپنے دلائل پیش کر رہی تھی۔ بار بار بُش کی وہ نیوز clipping بھی دکھائی جا رہی تھیں جس میں اس نے کہا تھا:

''ہم پاکستان کو پتھر کے دور میں پہنچا دیں گے وغیرہ وغیرہ'' عجب سرکس لگا ہوا تھا۔

''مگر امریکہ تو خود دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد ہے۔ تیل اور طاقت کے لئے پوری دنیا پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ یہ آج کے دور کی کالونائزیشن ہے۔'' علی کے ابو رہ نہ سکے اور بے قابو ہو کر بولے۔

نوجوان امریکی کے پاس اپنے دلائل تھے۔ میں نے گھبرا کر چینل ہی بدل دیا کسی انڈین چینل پہ ''مائی نیم از خان'' چل رہی تھی۔

''توبہ... اب انٹرٹینمنٹ کی دنیا کے بھی یہی موضوعات ہو گئے ہیں؟'' میں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر کہا اور کھانے کی میز سے برتن سمیٹنے لگی۔

''دنیا بدل چکی ہے۔ اب عشق و محبت کے بجائے دہشت گردی اور عالمی صورتحال کو موضوع بنائے بغیر انٹرٹینمنٹ کی دنیا بھی کامیابی حاصل نہیں کر پاتی۔'' انہوں نے سمجھانے کے انداز میں مجھے جواب دیا۔

اگلے روز میں شاپنگ مال میں اپنے سٹور پہ کام کر رہی تھی کہ حسب معمول تین بجے علی مجھے دروازے سے آتا دکھائی دیا۔ وہ خلاف معمول تیز تیز قدم اٹھاتا چل رہا تھا مگر میں نے اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ آتے ہی اس نے حسب معمول بیگ ایک کونے میں رکھا مگر نہیں اسے رکھنا نہیں، پھینکا ہی زیادہ مناسب ہوگا اور منہ سور کے بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا؟'' تم ٹھیک تو ہو بیٹا؟ موڈ کیوں اتنا خراب ہے؟ کھانا کھا لیا تھا؟'' میں نے حسب معمول اس سے ماؤں والے سوالات شروع کر دیئے۔

''آپ کو پتہ ہے آج سکول میں کیا ہوا؟'' علی نے نمناک آنکھوں سے روہانسی آواز میں کہا

''کیا؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے پوچھا

''میں جیسے ہی سکول پہنچا۔ سکول کے ساتھیوں نے مجھے کہا، ہمیں مبارکباد دو۔''

''اچھا؟ وہ کس بات پر؟'' میں نے حیرت سے پوچھا

”کہنے لگے... ہم نے تمہارا باپ پکڑ لیا، اسے مار دیا اور پھر سمندر میں دفنا دیا۔ تم کچھ بھی نہ کر سکے۔ وہ مجھ پر ہنس رہے تھے۔“ وہ غصے سے بولا

”اوہ....“ موقع کی نزاکت سمجھ کر میں خاموش ہو گئی۔ دل پر جیسے ایک گھونسہ پڑا۔ ”ہائے میرا بچہ....“ میرے لبوں سے نکلا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ مجھے اپنا بچہ بہت معصوم، بے خبر اور بے ضرر سا لگا۔ اسے تو خبر ہی نہیں تھی کہ وہ ان میں سے نہیں ہے جن میں وہ خود کو سمجھتا ہے۔ اسے تلخ حقیقتوں کا ادراک ہو رہا تھا اور میرا دل ٹوٹ کر پارہ پارہ ہوا جا رہا تھا۔

”بس بیٹا...! اب احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ ہم یہاں رہتے ہیں۔ یہ ہماری چوائس تھی کہ ہم یہاں آئیں، رہیں، ان کے نظام اور برتر معیشت میں سے اپنا حصہ ڈھونڈیں۔ ایسے حالات میں ہمیں برداشت کرنا اور خاموش رہنا ہو گا۔“ میں نے اس کو آغوش میں لیتے ہوئے پیار سے کہا

”مگر مام...! میں تو امریکن بارن ہوں۔ مجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے؟“ علی اب بھی لاجک کی بات کرتا چلا جا رہا تھا۔

”مام... ایہ ڈیم امریکن اتنے متعصب، تنگ نظر اور تھرڈ کلاسے ہیں۔ اتنی محدود سوچ ہے ان کی۔ انہیں تو دنیا کی سیاسی، معاشی، جغرافیائی سچویشن کا کچھ بھی نہیں پتہ۔ یہ لوگ صرف اپنے آپ کو صحیح سمجھتے ہیں۔ آخر سب مسلمان تو دہشت گرد نہیں ہوتے۔ ہم امن پسند ہیں۔ کیا امریکہ میرا ملک نہیں ہے؟ مام...! آپ لوگوں نے مجھے یہاں کیوں پیدا کیا؟ Where do I belong Mom“

علی کے سوالوں نے مجھے ہمیشہ کی طرح لاجواب کر دیا تھا۔

”نہ میرا رنگ گوروں کی طرح سفید ہے نہ کالوں کی طرح سیاہ۔“ وہ اٹھا اور اپنے چہرے کو سامنے لگے شیشے میں بغور دیکھنے لگا۔

”میں جا رہا ہوں مام۔“ وہ یکایک اٹھا اور اپنی جیکٹ پہننے لگا۔

”کہاں؟“ میں نے تجسس سے پوچھا

”آج میں شاپنگ مال کے سب سٹور والوں کو جو اب تک میری دوستی کا دم بھرتے تھے، جا کے سنا دوں گا کہ تم امریکن کس قدر متعصب اور مطلب پرست ہو۔ تم لوگ تنگ نظر ہو۔ یہاں میرا کوئی نہیں، میرا کوئی دوست نہیں، وہ گرینڈ پا بھی جھوٹ موٹ کا نانا دادا بنا ہوا ہے۔ یہ سب لوگ ہم کو تعصب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دشمن سمجھتے ہیں۔ میں آج ان کو خوب سناؤں گا مام۔“

”علی... رکو بیٹا... ایسا مت کرو... علی.... علی...“ میں چیختی رہ گئی مگر میرے آوازیں دینے کے باوجود وہ پیر پٹختا ہوا تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا اور اس نے میری ایک بھی نہ سنی۔ امریکن بھلا کہاں کسی کی سنتے ہیں؟

☆☆☆☆☆

شہید بے مراد

دسمبر کی آخری راتیں تھیں، بھیگی ہوئی ٹھنڈی ہموار سڑک پہ دوڑتے ہوئے سبک رفتار بس اچانک رُک گئی- ڈرائیور نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کئی بار بس کو دوڑانے کی کوشش لیکن انجن چند لمحے کی غرار کے بعد جھٹکے کے ساتھ بند ہو جاتا- ہار مانتے ہوئے ڈرائیور اور اسکے اسسٹنٹ نے چند صحت مند نوجوانوں سے درخواست کی کہ وہ بس کو دھکا لگا کر بیچ سڑک سے ایک طرف دھکیل دیں- تاکہ سڑک پہ دوسری گاڑیوں کی آمدورفت میں مشکل نہ پیش آئے- چلتی بس جس قدر شاندار، آرام دہ اور نفاست کا بہترین نمونہ تھی- رُک جانے کے بعد اب بھیانک، سرد، تاریک اور منحوس دکھائی دینے لگی- انجن کے بند ہو جانے سے بس کے اندر کی ہر چیز ٹھنڈی ہونے لگی- بڑی بڑی عمدہ نشستوں میں دبکے ہوئے لوگ بے چینی سے کروٹیں بدل بدل کر دوبارہ وہیں دھنس جاتے-

عبدالمجید نے ہمت کر کے اپنی کھڑکی کے شیشے پر سے پیلے رنگ کا دبیز پردہ ہٹا کر باہر جھانکنے کی کوشش کی لیکن شیشے پہ پھیلی اسکی اپنی سانس کی نمی نے شیشہ دھندلا دیا تھا- اس نے ضرورت سے زیادہ طاقت استعمال کر کے شیشہ کھسکایا- تو سرد ہوا کا ٹھنڈا جھونکا اسکے چہرے کو چھوتا ہوا اسکے گریبان سے ہوتا ہوا اسکے بدن پہ پھیل گیا- جھرجھری لے کر اس نے اپنی جرسی کس کر کوٹ بند کیے- اون کی دورنگی ٹوپی کو اچھی طریقے سے سر اور گردن پہ ٹھونستے ہوئے اس نے شیشہ ذرا سا اور دھکیل کر باہر جھانکا- اندھیرے میں غور سے دیکھنے کے بعد اسے گنے کے کھیت دکھائی دیے- سڑک کے قریب کھیتوں میں گنے کٹ چکے تھے- وہاں ایک وسیع اور گہرا تاریک خلا زمین پہ بچھا ہوا دکھائی دے رہا

کلیم خارجی

تھا۔ دُور کے کھیتوں میں لمبے گئے خاموش کھڑے رات کے پراسراریت میں اضافہ کررہے تھے۔ شدید ٹھنڈ میں اُبھرتے ہوئے خوف کو عبدالمجید نے اپنے اندر اُترتے ہوئے محسوس کیا تو اس نے کھڑکی بند کرکے اس پر دوبارہ پہلے دبیز پردے پھیلا دیئے ساکن، بے سہارا اور بے اماں بس کے اندر سردی بڑھنے لگی تو مسافروں پر گھبراہٹ اور بے چارگی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ چند گھنٹے پہلے ایک دوسرے سے مختلف مزاج اور حیثیتوں کے مسافر اب ایک ہی طرح سوچنے لگے تھے۔ عبدالمجید نے گردن گھما کر سب مسافروں کو دیکھا اور سوچا۔ ”جب یہ عالی شان بس اڈے پہ کھڑی تھی تو ہر مسافر اپنی برتری اور اہمیت کے احساس میں بس میں یوں قدم رکھتا جیسے وہ اپنے مفتوحہ علاقوں کی سیر پر روانہ ہورہا ہے۔ اچھی اور آرام دہ سیٹ کے سوا کوئی اور آدمی کسی کو نظر ہی نہیں آتا تھا۔ یہ فائدے اور خوشی کی تلاش میں نکلے ہوئے مسافر کتنے خودغرض، مغرور اور اپنی ذات کے تحفظ میں کتنے موقع پرست اور مکار ہوتے ہیں“۔ اپنے بارے میں سوچ کر عبدالمجید کے چہرے پہ بڑھی ہوئی سفید اور بے ترتیب داڑھی میں خارش ہونے لگی۔ داڑھی کھجاتے ہوئے اسکی ٹھوڑی نیچے ڈھلک گئی اور آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ”مجھے خود بھی تو اپنے سوا کسی سے دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو خودستی چیزیں خریدنے کے لیے نکلا تھا کہ انہیں دُکان میں رکھ کے مہنگے داموں بیچوں گا۔ اپنے نفع کے بارے میں خوشی خوشی اندازے لگاتے ہوئے میں نے اسے صورت حال کے بارے میں کب سوچا تھا۔ شاید کسی نے بھی نہیں سوچا تھا“۔ ساتھ والی بائیں جانب کی سیٹ پر ادھیڑ عمر سرکاری ملازم بیٹھا تھا۔ جس کے تیور اور جسمانی انداز عبدالمجید کو پہلی نظر میں اچھے نہیں لگے تھے۔ اب وہ شخص مانوس سا نظر آرہا تھا اب کیا ہوگا کہ بس چلے گی یا اں رات بھر یہیں سردی اور سناٹے میں کھڑی رہے گی۔ عبدالمجید کے اس سوال پر وہ بے نیازی سے بولا، پتہ نہیں ہمارے نصیب میں کیا ہے؟ عبدالمجید کچھ اور بھی سننا چاہتا تھا تاکہ اس پر طاری کیفیت کسی حد تک کم ہوسکے لیکن اس کا ہم سفر دو باتیں کرکے ہمیشہ کی بیگانگی میں ڈوب چکا تھا۔ اب وہ آدمی یکدم ایسے بدصورت لگنے لگا۔ عبدالمجید نے آنکھیں بند کرکے اپنی گردن پر کھجلی کرتے ہوئے سوچا۔ ”وہ لوگ جن کے مزاج بدلتے ہوئے حالات اور حادثوں کی وجہ سے تبدیل نہیں ہوتے وہ بدصورت ہوتے ہیں“۔ اچانک پچھلی نشستوں میں سے کسی آدمی کے

منہ سے غلیظ گالی گونجی اور پھر وہ چلاتے ہوئے بولا "اب ہم یہاں مریں گے؟ یہ کس طرح کا نظام ہے اس ملک میں آئے دن دھوکہ، فریب، دہشت گردی کے واقعات ہوتے رہتے ہیں ہم جیسے لوگ اس میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ کیا ہم چین اور سہولت کے حقدار نہیں ہیں کیا ہمارا ملک نہیں ہے کیا ہمیں مصیبتوں اور تکلیفوں کے یہاں رہنے دیا جاتا ہے اس نظام کی --- یہاں اس مقام پر نئی اور جدید ماڈل کی بس کا خراب ہو جانا۔ دہشت گردی کا منصوبہ، سازش ہے۔"

او بابا جی جلسہ نہ بناؤ۔ ایک نوجوان آدمی کی ملامت بھری آواز سنائی دی۔ یہ ملک جن کے لیے بنا ہے وہ اس میں خوش ہیں۔ اپنا اور ہمارا دل نہ جلاؤ۔ ہم تم کس باغ کی مولیاں ہیں بالکل، ایک اور طنز بھری آواز ابھری، ہم مولیاں ہیں گاجریں۔ اور ہم نے کتنا بکنا ہے، جانوروں کے چارے میں شامل ہوتا ہے، اس کے ساتھ ہی چند قہقہے گونجے عبدالمجید پہلے تو ہنس کر انجانے لوگوں کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ اور پھر جسم سکیڑ کے نشست میں دھنس گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ اور ماچس کی ڈبیہ نکالی۔ لیکن بس میں چڑھتے ہی مسافروں کو تنبیہ کر دی گئی تھی کہ سگریٹ نوشی منع ہے۔

اس کا دل چاہا کہ وہ سگریٹ احتجاجاً سلگائے۔ لیکن مسافروں کی تکلیف کے احساس کی وجہ سے وہ سگریٹ کی ڈبیہ پر اپنی انگشت شہادت سے کوئی دھن بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ مسافر احتجاج، مذمت، بے بسی کی حالت میں قانون، نظام انسانی زندگی کی بے وقعتی پر تبصرے کر رہے تھے۔ عبدالمجید نے سگریٹ اور ماچس کی ڈبیہ دوبارہ جیب میں ٹھونستے ہوئے پوری بس کا جائزہ لیا اسے یوں لگا جیسے مرد اور اندھیری رات میں ویرانے میں کھڑی بس کے اندر مظلوم پناہ گزین ہیں۔ جن کو دور پار شہروں اور بستیوں میں بسنے والے ظالم، مکار، منافق اور بے ضمیر، طاقتور لوگوں کا خوف ہے۔

"اب اس بس کے مالک ہی کو دیکھ لیں"، ایک مانوس آواز پھر سنائی دی۔ "اس نے ہمیں سہولت آرام اور تحفظ کا جھانسہ دیکر ہم سے رقم بٹور لی۔ اور پھر ہمیں یہاں مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ او حضرت آپ اس بس کی بات کرتے ہو ایک گنجا آدمی غرایا۔ یہاں کی ریلیں، ہوائی جہاز، گاڑیاں، ہسپتال، سکول، کالج، یونیورسٹیاں سب میں ایک جیسے ہیں۔ منزل سے بھٹکا کر بیچ رستے میں کھڑا کر دینے والے سب ایک جیسے ہیں۔"

مسافروں کی گفتگو اور تبصروں سے مشتعل

ہو کر ایک نوجوان چھلانگیں لگاتے ہوئے ڈرائیور کے کیبن تک پہنچ گیا۔ اس نے بڑے جارحانہ انداز سے المونیم کے دروازے پر تھپڑ مارنا شروع کر دیئے دروازہ کھلتے ہی ڈرائیور کا بے خوف و بے حس چہرہ، نیند اور نشے کی وجہ سے سرخ آنکھیں سب مسافروں نے دیکھیں۔ یکایک اس کے چہرے کا رنگ غصے سے پیلا ہو گیا۔ لیکن نوجوان بے خوفی سے بولا "تم ہمیں اس ٹھنڈ، اندھیری اور ویران جگہ پر مصیبت میں ڈال کر مزے کر رہے ہو ہم کوئی تمہارے غلام ہیں۔ یا تمہارے اغوا کیے ہوئے لوگ ہیں تمہیں احساس نہیں ہمارے لیے دوسری بس کا فوری بندوبست کرو"۔

پچھلی نشستوں سے جانی پہچانی آواز میں ایک دھمکی ابھری۔ اسے کھینچ کر یہاں لے آؤ چلو اس کو ٹھنڈ میں بس سے نیچے اتاریں۔۔۔ مسافروں کے تیور دیکھ کر ڈرائیور شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بس کے درمیان مسافروں کے پاس آ گیا۔ اور دوستانہ ہمدردی سے بولا۔ میرے بزرگو عزیزو میں بھی تمہارے جیسا آدمی ہوں۔ نوکر ہوں۔ تنخواہ پر ملازم ہوں۔ بس کے انجن کی وجہ سے مجھے بھی تکلیف ہے۔ میں کیبن میں تم سب کو نہیں بٹھا سکتا۔ آرڈر نہیں ہے وہاں صرف تین آدمیوں کی گنجائش ہے جو کہ بس کے ذمہ دار لوگ ہیں۔ اب وہاں تو آپ میں سے کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ قیمتی اور پرائیویٹ چیزیں بھی تو ہوتی ہیں۔

مثلاً وہاں کیا پڑا ہے۔ ایک دبلا کالا آدمی پہلی مرتبہ بولا۔ تم تمہارے اسسٹنٹ اور اس خاتون کے علاوہ وہاں کچھ ہے۔

آدمی کی یہ بات سن کر ڈرائیور کا لہجہ سخت ہو گیا۔ اور وہ دھمکی دیتے ہوئے بولا۔ سنو یارو، یہ کمپنی۔ اور یہ بس حاجی کرم علی صاحب کی ہے۔ وہ ایم۔ این۔ اے ہیں اپنے علاقے کے جاگیردار ہیں۔ ان کی چلتی ہے۔ میں انہیں ابھی فون کروں تو چند منٹ میں ان کے بندے یہاں پہنچ جائیں گے۔ اور پھر یہاں بڑا فساد برپا ہو گا۔

عبدالمجید کافی دیر سے ٹھٹھرتے ہوئے یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ ڈرائیور کی بات سن کر وہ غصے میں چیخ کر اور لرزتے ہوئے ڈرائیور کے پاس آ کر دھاڑا۔ "تم کس مزاج کے آدمی ہو تم کرم علی کے غنڈوں کو یہاں فساد کے لیے بلوا سکتے ہو۔ لیکن ہماری مدد کیلئے تمہارے پاس کوئی حل نہیں ہے۔ تم کتنے رذیل قسم کے غلام ہو۔ یعنی کہ تمہاری ایک ایک بات، ایک ایک حرکت سے کرم علی کے جاہ و جلال میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تم تو کرم علی کی سفارش پر پیدا ہوئے ہو۔ یا اسی کے نطفے سے ہو"۔ عبدالمجید

کا اشتعال دیکھ کر ایک آدمی نے تحمل اور ہمدردی سے اسکے پہلو میں ہاتھ دے کر اسے قریب کی سیٹ پر بٹھا دیا۔ ڈرائیور تھکے پھیلاتے ہوئے بولا۔ بس تیرے سفید بالوں پہ نظر پڑ جاتی ہے ورنہ---

ڈرائیور اور راستے میں کھڑے دوسرے مسافروں کو پرے ہٹاتا ہوا ایک آدمی نمودار ہوا۔ اسکی سفید اور گھنی داڑھی سے اسکے چہرے پہ رعب تھا۔ نمازیں پڑھ پڑھ کر اسکے ماتھے پہ محراب ابھر آئی تھی وہ ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ میرے بھائی گاڑیوں کو حادثے پیش آتے رہتے ہیں خیر ہوئی کہ انجن خراب ہو گیا۔ اگر بس کسی گڑھے میں گر جاتی - تو ہم کیا کرتے - جو تقدیر میں لکھا ہوتا - وہ ہو کے رہتا ہے۔ آپ یوں کریں کمپنی والوں سے رابطہ کریں۔ ابھی سوا بارہ بجے ہیں لوگ جاگ رہے ہوں گے۔ آج کل لوگ ویسے بھی راتوں کو دیر تک جاگنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں ٹھیک ہے۔ ڈرائیور نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ہم نے پہلے بھی بات کی تھی اب دوبارہ رابطہ کر لیتے ہیں یہ کہہ کر ڈرائیور اپنے اسسٹنٹ کو لے کر دوبارہ اپنے کیبن میں جا گھسا۔

بس میں بہت دیر تک سکون رہا۔ بس میں موبائل فون کی گھنٹی گونجی۔ ڈرائیور کے کیبن کا دروازہ پیٹنے والا نوجوان بولا۔ ''اچھا تم بچ گئے۔ ہماری بس نظر آ گئی؟ بس تم اس بس کے پیچھے ذرا فاصلے پہ کھڑے آ کر گاڑی موڑ لو۔ میں یہ آیا''۔ نوجوان نے جلدی سے اپنا بیگ کمر پہ لٹکایا۔ اور بڑی شخ مندی سے اور بے پروائی سے اس نے بس سے باہر چھلانگ لگا دی۔ کئی مسافروں نے جھانک کر اسے کار کی طرف بھاگتے دیکھا۔ اس کے اس طرح چلے جانے سے بس میں ماتم کی فضا بن گئی۔ پھر موبائل فونوں کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ لوگ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی اپنی مصیبت اور بس کے بارے میں اطلاعات اور معلومات فراہم کرتے جا رہے تھے۔

ذرا سی خاموشی ہوئی۔ تو گھنگھریالے بالوں والا ایک نوجوان اپنی سیٹ سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''معاملہ میری برداشت سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ میں اس کمپنی کے مالک کو اور اس ڈرائیور کو زندگی بھر کیلئے سبق سکھا سکتا ہوں''۔ مایوس، ہارے اور تھکے ہوئے لوگوں نے انتقام کی تسکین کے ساتھ اُسے بڑی تعریفی نظروں سے دیکھا۔ لوگوں کو مرعوبیت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ دیکھ کر۔ نوجوان جرأت اور ہم جوئی کے جذبے سے سینہ پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''میں بڑی آسانی کے ساتھ ۵ منٹ کے اندر اس پوری بس کو آگ لگا کر اسے راکھ اور کوئلے میں تبدیل کر سکتا

ہوں"۔ زبردست عبدالمجید نعرہ لگا کر اپنی سیٹ سے اچھل کر نوجوان کے پاس آیا اور اپنی جیب سے ماچس نکال کر اسے ہلاتے ہوئے بولا میں تمہارے ساتھ ہوں۔

ماتھے پہ محراب کے نشان والا رعب دار آدمی دوبارہ نمودار ہوا۔ اور اپنے تسبیح والے ہاتھ کو مشتعل نوجوان کے چہرے کے قریب لہراتے ہوئے بولا ۔ "شاباش، تمہارے حوصلے کی داد دیتا ہوں لیکن شاید اس کی نوبت نہ آئے ممکن ہے ڈرائیور نے کسی سے رابطہ کرلیا ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی بس آجائے ۔ آخر ان لوگوں نے ہم سے کرایہ لے رکھا ہے۔ تم تحمل سے ذرا انتظار کرلو"۔ سب نے اسکی تائید کی ۔ نوجوان خاموشی سے سر ہلاتا ہوا اپنے بازو سینے پہ باندھے کھڑا تھا کہ عبدالمجید نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی سیٹ پہ بٹھا دیا اور خود بھی اسکے ساتھ بیٹھ گیا۔ اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ایسے حالات میں بھی کچھ کرنا پڑتا ہے ۔ نوجوان نے دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اسکی طرف دیکھا تو عبدالمجید نے گرمجوشی سے اسکا ہاتھ بھینچ لیا۔

نوجوان کی دھمکی سے تمام مسافروں کی بے کلی اور مایوسی میں کسی حد تک کمی آگئی تھی۔ مسافر اپنے اپنے موبائل فونوں پہ باتیں کرتے بھی سنائی دے رہے تھے۔ کر

ماتھے پہ محراب والا معتبر آدمی اپنا بیگ کاندھے پہ سنبھالتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کسی سے فون پہ بات کرتے جا رہا تھا ٹھیک ہے میں آرہا ہوں۔ موبائل فون جیب میں رکھتے ہوئے پھر وہ بولا ۔ میرے بھائیو ۔ مجھے میرا بھتیجا لینے آپہنچا ہے الحمد اللہ، اللہ آپ کا حامی وناصر ہو۔ یہ کہہ کر اس نے نیچے جست لگائی۔ اور کسی کو بات کا موقع دیے بغیر بس کے قریب ایک خوبصورت اور مہنگی کار میں جا گھسا۔

عبدالمجید تمام مسافروں کی طرح محرومی اور بے بسی سے گھورتے ہوئے سر ہلاتے رہ گیا۔ خاموشی اور مایوسی کے سرد لہجے میں اس نے قریب بیٹھے ہوئے نوجوان سے آہستگی سے کہا، بس کو آگ کس طرح لگائی جاسکتی ہے، نوجوان سنجیدگی اور کینے سے بولا، میں نیچے اترتا ہوں ۔ تھوڑی دیر بعد تم بھی احتیاط اور خاموشی سے نیچے اتر آنا، نوجوان تحمل اور آہستگی یوں نیچے اترا جیسے اسے واش روم کی طلب ہو موقع پا کر عبدالمجید بھی نیچے اتر گیا۔ نوجوان بس کے پچھلے حصے کی طرف خاموشی سے عبدالمجید کا منتظر تھا۔ عبدالمجید کو دیکھتے ہی وہ بڑے بڑے ستاروں والی زمین سے اٹھی ہوئی لمبی اور بھاری بس کے نیچے پہیوں کے بل گھستے ہوئے بولا،

پیچھے آ جاؤ۔

عبدالمجید بھی گھٹنوں کے بل اس کے پیچھے ہولیا۔ رینگتا ہوا نوجوان ایک جگہ پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے بولا "یہ ہے فیول ٹینک اور یہ ہے فیول پائپ" "یہ ہے فیول فلٹر۔ یہ آرہا ہے فیول پائپ--- پھر وہ رینگتے ہوئے بس کے سٹیرنگ والے حصے کے قریب جا کر بولا۔ یہ ہے فیول فلٹر۔ یہ آرہا ہے فیول پائپ--- یہاں سے فیول پائپ لیک کرکے اس میں سوراخ کرکے ۔سارا ڈیزل نیچے بہایا جاسکتا ہے۔ پوری بس کے نیچے ڈیزل پھیل جائے گا۔ تاروں پہ بھی کسی چیز کے ذریعے ڈیزل پھینکا جاسکتا ہے۔ اندر سیٹوں پہ بھی۔ اور بس۔ چند منٹ کا کام ہے۔ سمجھ آ گئی"۔ نوجوان نے اپنے موبائل فون کی لائٹ آف کرتے ہوئے کہا۔ چلو جلدی آؤ بیٹھے ہوئے مسافروں میں سے کوئی آدمی شک اور خوف کی وجہ سے ہنگامہ کھڑا نہ کردے۔ نوجوان نے اپنی کسی ہوئی پتلون سے اچھی طرح مٹی صاف کی اور بس میں چڑھ کر سیٹ پہ جا بیٹھا۔ عبدالمجید نے سردی کی پرواہ کیے بغیر سگریٹ سلگائی۔ اور دھند میں دھوئیں کے مرغولے چھوڑتے ہوئے آپ ہی آپ مسکرانے لگا۔ سگریٹ پھونکتے ہوئے کھنکارتے ہوئے وہ نوجوان کے قریب بیٹھ کر عجیب طرح کی خوشی محسوس کرتے ہوئے بولا۔ یہ فیول پائپ کیسے کٹے گا۔ اس میں سوراخ کس طرح ممکن ہے۔ وہ تو لچکدار ہے۔ مگر بھی مشکل ہے۔ نوجوان نے جوش کے ساتھ اپنی جرسی کھینچ کر آستین اوپر کی۔ اور اپنی کلائی پہ پہنے ہوئے سٹیل کے ایک موٹے اور چمکتے ہوئے کڑے کو گھماتے ہوئے اس نے کلائی سے کڑا اُتار لیا۔ اور کڑے کے درمیان کی چوڑیاں گھما کر اس نے عبدالمجید کے سامنے کردیا۔

عبدالمجید حیران و پریشان ہوکر دیکھتا رہ گیا۔ اس کے سامنے ایک انچ کے پھل والا تیز اور باریک خنجر چمک رہا تھا۔ دلچسپی اور تجسس سے عبدالمجید نے اُسے پکڑا اچھی طرح مٹھی میں دبا کر دیکھا اور بولا اس سے تو پورا آدمی قتل کیا جاسکتا ہے۔ یہ آڑے وقت کا ہتھیار ہے نوجوان ہنستے ہوئے بولا۔ خنجر ابھی تک عبدالمجید کے ہاتھ میں تھا۔ وہ دوبارہ اسے کڑا بنا کر اپنی کلائی میں پہننے کی کوشش کررہا تھا۔ اسکی دلچسپی کو دیکھ کر نوجوان نے اُسے سکھاتے ہوئے کڑا بنا کر عبدالمجید کی کلائی میں پہنا دیا۔ عبدالمجید اس پر انگلیاں پھیر کر گھماتا رہا۔ پھر وہ خود ہی کڑا کھولتا اور بند کرتا رہا۔ اس دوران کئی مسافر بس چھوڑ کر جاچکے تھے۔ عبدالمجید کو اس وقت ہوش آیا۔ جب اسکے قریب بیٹھے ہوئے کڑے والا نوجوان خوشی سے موبائل

فون پہ نعرہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”زندہ باد۔ تم پہنچ گئے۔ کمال کر دیا۔ یار تم نے۔ یہ میں نیچے آ گیا ہوں“۔ عبدالمجید کے دیکھتے اور سنبھلتے سنبھلتے نوجوان بیگ اپنا لہراتے ہوئے نیچے کود کر دور کھڑی کار کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ عبدالمجید کو پہلی بار شدید سردی اور شکست کا احساس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی گہرے اور یخ بستہ سمندر میں کسی تختے پر اکیلا تیر رہا ہے۔ بے بسی سے گردن نیچے کر اس کا دل چاہا کہ وہ رو پڑے۔ لیکن کڑے سے کھیلتی ہوئی اپنی انگلیاں دیکھ کر اُسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اسکی ساری بے بسی اور سراسیمگی دھواں بن کر اُڑ گئی۔

اسے یکدم اپنے اندر ایک توانائی سی محسوس ہونے لگی اپنے ارادے کی مسرت سے اُس نے بس کا جائزہ لیا۔ آدھے سے زیادہ مسافر غائب ہو چکے تھے اور جو موجود تھے وہ بھی انتظار اور اُمید کی کیفیت میں موبائلوں میں گم تھے، کڑے سے کھیلتے ہوئے عبدالمجید کی آنکھ لگ گئی تھی۔

چند مسافروں کے بس سے نیچے اُترنے کی آواز سے اُسکی آنکھ کھلی۔ اُس نے اپنی گھڑی دیکھی رات بیت چکی تھی۔ ساڑے چار بج رہے تھے۔ اپنے سوا اُسے کوئی اور مسافر نظر ہی نہ آیا۔ وہ آرام سے اُٹھا اپنے موبائل فون سے لائٹ آن کر کے وہ بس کے نیچے جا گھسا۔ کڑا گھما کر وہ پہلے ہی خنجر بنا چکا تھا۔ فیول پائپ کو چھوتے ہوئے اس نے موبائل فون جیڑے میں کس لیا۔ انجن کے بالکل قریب اس نے نہایت آسانی سے فیول پائپ میں سوراخ کر ڈالا، ڈیزل کی ٹھنڈی دھار نے اسکی پوری آستین اور کوٹ بھگو دیا۔ اپنی کامیابی کا لطف اُٹھاتے ہوئے اس نے دو تین جگہ سے فیول پائپ میں سوراخ کر دیے۔ زمین پر پھیلتا ہوا ڈیزل دیکھ کر وہ بس کے نیچے سے نکل کر باہر آ گیا۔ اور جیب سے ماچس نکال کر اس سے کھیلنے لگا۔

سردی سناٹے اور اپنے بدن سے ڈیزل کی بُو سونگھتے ہوئے اُسے یوں لگا جیسے وہ ایک ٹھوکر سے پوری بس کو الٹ دے گا۔ تھکن، کپکپاہٹ، کمزوری کے برعکس اس کے خون میں جوش اور مسرت کی لہر دوڑنے لگی تھی، دیا سلائی نکالتے ہوئے وہ سر جھکا کر کھڑا رہا۔ بس کے نیچے سے ڈیزل اس کے پیروں تک بہتا چلا آ رہا تھا۔ اچانک دیا سلائی نیچے گر پڑی۔ دوسری دیا سلائی نکالنے کے بجائے اس نے ماچس جیب میں ٹھونستے ہوئے خود سے کہا۔ میں کس لیے بس کو آگ لگاؤں۔ صرف اپنے لیے۔ سب لوگ جہاں جانا چاہتے تھے۔ چلے گئے۔ میں کن لوگوں کے لیے اتنا بڑا قدم اُٹھانے لگا ہوں۔ آگ لگانے سے مجھے کونسی فتح حاصل ہو

گی۔۔۔ فضول ہے۔ "مجھے اپنی جان کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے" کپکپاتے ہوئے اس نے اُلٹے قدم لوٹتے ہوئے بس کے آس پاس کے علاقے کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ چلتے ہیں کسی قریب کی بستی میں مسجدیں کھلنے والی ہیں۔ اذانیں ہونے والی ہیں۔ کہیں چائے پیتے ہیں۔ اور گھر لوٹ کر آرام سے نیند پوری کرتے ہیں۔

وہ بے غمی اور اطمینان سے بس کے پیچھے والی سڑک سے جیسے واپس لوٹنے لگا۔ چند قدم چلتے ہی اُسے اذانوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اُسے ایک آزادی اور اطمینان کا احساس ہوا۔ جیسے وہ ایک تاریک ٹھنڈے غار سے باہر نکل آیا ہو۔ اذانوں پہ کان دھرے وہ چلا جا رہا تھا۔ کہ اُسے سناٹے میں گونج دار انجن کی آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ وہ جس بس سے نیچے اترا تھا۔ وہ سٹارٹ ہو کر رینگنے لگی تھی۔ اسکے پیچھے والی سرخ بتیاں روشن ہو کر جگمگا رہی تھیں۔ اسکے دیکھتے دیکھتے ہی بس نے رفتار پکڑ لی۔ وہ پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے بس کی طرف لپکا دوڑتے ہوئے وہ بس کے ٹائروں کے نشانوں تک پہنچ گیا۔ ہارے ہوئے گھڑ سوار کی طرح وہ تیزی سے دور جاتی ہوئی بس کو غم، غصے اور حسرت میں دیکھتے ہوئے سسکنے لگا۔

اُس کے ذہن میں اُبھرتے ہوئے سوال کلاشنکوف کی گولیوں کی طرح اس کے دماغ میں تڑتڑانے لگے۔ اُس نے آنکھیں میچ لیں۔ احساس زیاں کی اذیت سے اس کا سینہ پھٹ کے یوں دھڑکنے لگا۔ جیسے وہ زندگی کے بہت قیمتی سرمائے سے ہاتھ دھو بیٹھا ہو۔ زندگی کی آخری کوشش کرتے ہوئے اُسے نے جیب سے ماچس نکالی۔ ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے دیا سلائی جلائی اور دور غائب ہوتی بس کے تعاقب میں اس نے کسی معجزے کی آس میں جیسے ہی دیا سلائی اُچھالی۔ اُسکی آستین سے شعلے بھڑک اُٹھے۔ چند لمحے تو آگ کی حرارت سے اُسے ایک عجیب سی تسکین محسوس ہوئی۔ تپش تکلیف دہ ہوئی تو اس نے دوسرے ہاتھ سے آستین جھاڑ کر آگ بجھانا چاہی۔ جلتے ہوئے کپڑے کے چند ٹکڑے ڈیزل میں ڈوبے ہوئے اس کے پاؤں میں گر پڑے۔ ایک الاؤ سا بھڑک اُٹھا۔ مسجدوں سے آتی اذانیں دھیمی ہوتی جا رہی تھیں اس کے کان خود اسکی خوفناک چیخوں سے پھٹنے لگے۔ وہ چیخ چیخ کر اچھلتا رہا۔ اور پھر دہکتی ہوئی آگ میں اُبھر اُبھر کے ڈوبتا گیا۔ کنارے سے اٹھتی ہوئی نیلی پیلی بھک بھک کرتی لکیریں سڑک پر چڑھ کر پھیلی ہوئی دھند میں دھواں بنتی جا رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆

بدمزہ کافی

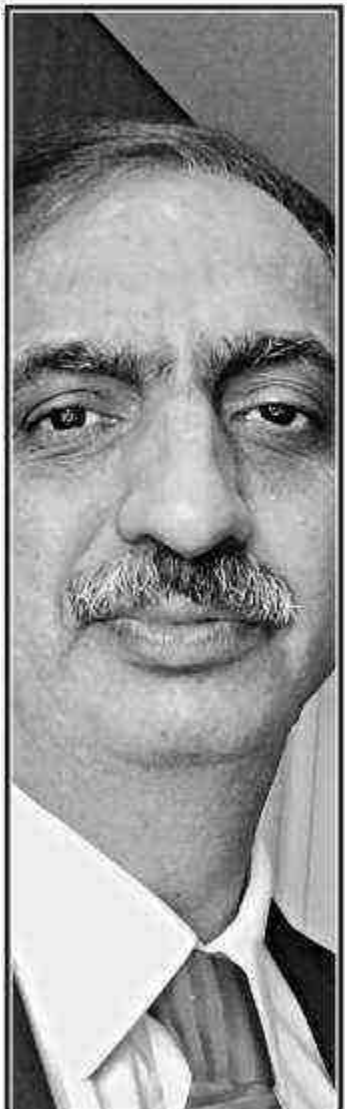

حبیب الرحمٰن

کافی شاپ کی کھڑکی سے ڈھلتی شام کی برستی بارش شائد اس کو بہت دیر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھتی لیکن میز پر دھری جانے والی کافی کے مگ سے اٹھنے والی بھاپ نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ محمد حسین جواب ایم ایچ کہلاتا تھا کئی سال پہلے جب یہاں آیا تھا یہ قصبہ بہت چھوٹا تھا اور یہ کافی شاپ تب بھی یہیں موجود تھی۔ یہ الگ بات کہ تب مارک خود یہاں کافی بناتا اور اپنے ہاتھ سے بلینڈ (blend) کرتا اور اب اس کا بیٹا سائمن مشینوں کی مدد سے یہ سارے مرحلے سر کرتا۔

ایم ایچ نے سڑک کے پار ایک بار پھر دیکھا اور کافی کی ایک چسکی لے کر اس سرور کو حاصل کرنے کی کوشش کی جو ہمیشہ وہ کافی کے پہلے گھونٹ سے محسوس کیا کرتا تھا۔ دھیرے دھیرے کافی کے ایک دو گھونٹ بھرنے کے بعد اسے شدت سے احساس ہوا کہ کافی بے مزہ ہے۔ اس نے آنکھیں کھولیں کھڑکی سے باہر بڑھتے ہوئے اندھیرے کی طرف دیکھا اور پھر کاؤنٹر پر کھڑے سائمن کو پاس بلایا

سائمن کیا بات ہے --- آج ریسپی (recipe) کچھ تبدیل تو نہیں کی --- ایم

ایچ شکایت کرتے ہوئے بولا
نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں سائمن دھیمے لہجے میں بولا---لایئے میں خود کافی بلینڈ کر کے آپ کو دوبارہ پیش کرتا ہوں سائمن نے بڑی محنت سے کافی دوبارہ تیار کر کے اس کے سامنے رکھی تو کافی کی مہک دور ہی سے کہہ رہی تھی کہ مجھ سے زیادہ ذائقہ دار کافی ہو ہی نہیں سکتی---ایم ایچ نے سائمن کا شکریہ ادا کیا اور نئی بنی ہوئی کافی کا گھونٹ بھرا-اس نے مسکراتے ہوئے سائمن کی طرف دیکھا ضرور لیکن سچ پوچھئے تو وہ اس مزے کو حاصل نہ کر سکا جس کے لیے ہمیشہ وہ اس کافی شاپ پر آیا کرتا تھا-اس نے جیسے تیسے کافی ختم کی اور چھتری تان کر گھر کی طرف چل پڑا-ہلکی بارش میں فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ہمیشہ اس کے دل میں جلترنگ بجا کرتے لیکن آج ایسا ہو نہیں سکا اور وہی ایم ایچ جو ہمیشہ ہلکی لے میں پرانے فلمی گیت گنگناتا گھر لوٹا کرتا تھا چھتری تانے پاؤں گھسیٹتا اور بارش سے بچتا بہت ہی بیزار اپنے اپارٹمنٹ تک پہنچا-
زرینہ جسے کئی سالوں سے زی ہی کہا جاتا تھا لاؤنج میں ٹی وی دیکھتی جانے کب سے اس کی منتظر تھی ---
ریٹائرمنٹ کی پہلی شام مبارک------زی اس کا استقبال کرتے ہوئے بولی---ایم ایچ نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن مسکرا نہ سکا اور چھتری مرکزی دروازے کے پاس رکھنے کے بعد گیلے کپڑے جھاڑتا ہوا لباس بدلنے کے لیے کمرے کی جانب بڑھ گیا-
برسوں پہلے جب اسے بلجیم کے اس چھوٹے سے شہر بروگز (Brugges) منتقل ہونا پڑا تو اس کی خوشی دیدنی تھی-اس کے دوستوں کا کہنا تھا کہ لاہور میں بسنے والوں کی روح میں لاہور بستا ہے اور لاہور سے دوری لاہوریوں کو دھیرے دھیرے مار دیتی ہے لیکن ایم ایچ کے ساتھ ایسا ہوا نہیں-والد سے رخصت ہو کر سنت نگر سے گھوڑا ہسپتال پہنچنے تک وہ یورپ کے خوبصورت خوابوں میں اس حد تک کھو گیا کہ اسے ائیرپورٹ سے دبئی اور دبئی سے برسلز (brussels) تک کے سفر میں کوئی یاد اپنے حصار میں نہ لے سکی-برسلز سے ریل کے دو گھنٹے سفر کے بعد اسے اپنی منزل بروگز (Brugges) جانا تھا جو بیلجیم کی بندرگاہ سے چند میل دور آباد ایک چھوٹا سا شہر ہے-بروگز کا موسم معتدل تھا لاہور کی شدید گرمی نہ بقیہ یورپ کی طرح کی شدید سردی اور برف باری-پرانے طرز تعمیر کے درمیان چھوٹے پتھروں کی راہداریوں اور چھوٹی چھوٹی نہروں کے درمیان خزاں زدہ راستے-محمد حسین جب ان راہداریوں پر چلتا تو اسے یوں لگتا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے-نوکری کام اور خوبصورت موسم اسے ہر وقت ایک ایسے سرور میں جکڑے رکھتے جو اسے پیچھے مڑنے کا موقعہ نہ دیتے-ماں بچپن میں ہی وفات پا چکی تھی، گھر میں

وہ اور اس کا باپ ہی تھے - اس کے والد نے بہت کوشش کی کہ وہ اکلوتے بیٹے کو گھر سے دور جانے سے روک سکے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا- محمد حسین کا یورپ جا کر کچھ عرصہ والد سے رابطہ رہا لیکن پھر یہ سلسلہ بھی عید مبارک کے کارڈ تک محدود ہوتا ہوا دھیرے دھیرے ختم ہو گیا - اسے والد کی بیماری کی خبر ہی ہو سکی اور نہ اس کے دنیا سے جانے کا پتہ چلا- مدتوں بعد جب اسے علم ہوا تو بہت سا وقت بیت چکا تھا-

زرینہ اس کی فیکٹری کے مرکزی دفتر میں برطانیہ سے ٹرانسفر ہو کے آئی تو ایم ایچ کو اندازہ نہیں تھا کہ یہی زرینہ جسے فیکٹری میں سب زی کہتے تھے اس کی زندگی میں داخل ہونے والی ہے - یوں تو زی کا تعلق سانده سے تھا لیکن وہ پیدا برطانیہ میں ہی ہوئی تھی اور اس نے پاکستان دیکھا تک نہیں تھا- زندگی میں جو رنگ نہیں تھے وہ زرینہ نے بھر دیئے -- اللہ نے ایک بیٹا ارسلان عطا کیا جس میں اپنے باپ کی طرح ہی محنت اور ہدف کی لگن موجود تھی - وہ بھی ایم ایچ کی طرح خواب دیکھتا اور اپنی دنیا میں مگن رہتا- گرایجویشن کے بعد بیٹے کو امریکہ جانے کا موقعہ ملا تو وہ اپنی دنیا بسانے واشنگٹن منتقل ہو گیا اور پچھلے سات سال سے وہیں مقیم تھا- سات سال پہلے ایم ایچ جب ارسلان کو برمنگھم ایئر پورٹ چھوڑ کر پلٹا تھا تو کچھ دیر اداسی اسے گھیرے رہی لیکن پھر زندگی کی معروفیت میں وہ سب کچھ بھولتا چلا گیا- اپنی دوڑ اور دفتری ہنگاموں میں اسے کئی سال احساس ہی نہ ہوا کہ اس کے بیٹے کو امریکہ منتقل ہوئے سات سال ہو گئے ہیں اور وہ جانے کے بعد کبھی بھی والدین سے ملنے نہیں آیا - زی کبھی کبھی تنہائی کا رونا روتی لیکن اسے تو دفتر کے ہنگاموں رومان پرور موسم اور بروگز کی گلیوں میں وہ سرور حاصل ہوتا کہ وہ اس احساس کو محسوس ہی نہ کر سکتا جس کا اظہار زی کبھی کبھار کیا کرتی-

کئی سال بعد آج شام کافی پیتے ہوئے اسے لاہور یاد آیا سنت نگر کی گلیاں لاہور کی بارش ماں کی قبر والد کے آخری بار گلے ملنے کا احساس اور ان کے کھردرے ہاتھوں کا لمس- برسوں بعد بروگز کی بھیگی شام اسے اچھی نہ لگی- اسے اتنے سال احساس ہی نہ ہو سکا کہ اس کا بیٹا کب سے اس سے رخصت ہو کر جانے کہاں بس گیا ہے اور وہ زی کے ساتھ اکیلا رہ گیا ہے- اس نے پہلی بار اس دکھ کو شدت سے محسوس کیا جو اس کے باپ نے برسوں پہلے اس سے جدا ہو کر محسوس کیا تھا- اسے پہلی بار لگا کہ عہدے پیسے اور ترقی اکیلا کر دیتے ہیں- کافی شاپ سے نکلتے ہوئے وہ سنت نگر کی گلیوں کے کیچڑ اور اپنی کچی چھت کو یاد کرتا گھر کی طرف چلا تو ہر شے بے رنگ ہو چکی تھی-

ایم ایچ کپڑے بدل کر آیا اور زی کے پاس لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگا اسے ٹی وی

پر لگے پروگرام بہت بور لگے اس نے ٹی وی کا ریموٹ پکڑا اور تیزی سے چینل بدلنے لگا۔ زی اس کی عادت سمجھ کر کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر اٹھ کر ڈنر کی تیاری کرنے لگی۔ ایم ایچ کا خیال تھا کہ زی کو اندازہ ضرور ہوگا کہ کچھ مختلف ہے لیکن ایسا ہو نہیں سکا اس نے بددلی سے رات کا کھانا کھایا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا کافی دیر بستر پر لیٹ جانے کے بعد اسے جانے کب نیند آئی اور جانے کب صبح ہوگئی۔

آج تو آفس بھی نہیں جانا---- زی نے مسکراتے ہوئے اسے صبح بخیر کہا اور کمرے کے پردے ہٹا دیے۔ دور تک دھند اور ہلکی بارش سارے منظر کو لپیٹے ہوئے تھی۔ یہ منظر جو برسوں ایم ایچ کو دیوانہ بنا دیتا تھا آج اسے بے کیف اور بے رنگ لگ رہا تھا ---- اس نے کمبل دوبارہ منہ کے اوپر لے لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا

دس بجے زی اسے دوبارہ اٹھانے بیڈ ٹی لے کر آئی تو اس کے پاس بیٹھ گئی

کیا بات ہے--- زی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی--- نوکری ختم ہوئی ہے زندگی تو نہیں--- کل تک تو تم پتہ نہیں کون کون سے منصوبے بنا رہے تھے---

ہاں ---- پروگرام تو بہت سے تھے ---- لیکن --- ایم ایچ اداسی سے بولا --- لیکن دل مر گیا ہے---

نوکری ختم ہونے سے مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی فلم ایک دم سے ختم ہوگئی ہے جیسے کسی ناول کا آخری صفحہ کوئی پھاڑ کر لے گیا ہے جیسے تیزی سے چلتی ہوئی گاڑی کی ہیڈ لائٹس گھپ اندھیرے میں اچانک سے بند ہوگئی ہیں اور کچھ نظر نہیں آ رہا--- برسوں بعد مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں آج ہی لاہور سے آیا ہوں--- اور لاہور کے بغیر میرا دم گھٹ جائے گا ----

مجھے لاہور جانا ہے ---- کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ایم ایچ رندھی ہوئی آواز سے بولا۔

ڈپریشن ہوگیا ہے شاید تمہیں ----- زی تلخی سے بولی---

ایم ایچ نے کوئی جواب نہ دیا اور آنکھیں بند کر کے امڈتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرنے لگا

سنو--- تمہیں ایک ریٹائرمنٹ سرپرائز دوں --- زی سائیڈ ٹیبل کا دراز کھولتے ہوئے بولی--- یہ دیکھو واشنگٹن کے ٹکٹ ----

مجھے امریکہ نہیں لاہور جانا ہے----- ایم ایچ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا

لاہور میں کون ہے تمہارا---- زی قدرے تلخی سے بولی--- دو قبریں ------

امریکہ میں کون ہے میرا--- ایم ایچ لفظ چباتے ہوئے بولا اور خاموشی سے زی کی لائی ہوئی بھاپ اڑاتی بدمزہ کافی کے گھونٹ بھرنے لگا-----

☆☆☆☆☆

کچرا

جھکا ہوا جسم، استخوانی چہرہ، کھچڑی بال، چہرے پر جھریوں کا بے تحاشہ جال، ڈھیلا ڈھالا ٹراوزر پہنے، اور اس ٹراوزر کے اوپر نہ جانے کتنے مہینوں سے وہی میلی کچیلی زرد رنگ کی ٹی شرٹ پہنے وہ حسب معمول سب گھروں سے کچرا اٹھانے میں مصروف تھا۔

ڈینئیل نام تھا اسکا۔ محلے کے کم ہی لوگ اسکو، اسکے اصل نام سے بلاتے تھے۔ عموماً وہ اپنے نام کی جگہ "کچرے والے" سننے کا عادی تھا۔ عمر شاید چالیس کے پیٹے میں ہوگی، یاد تو اس کو بھی نہیں تھی ٹھیک سے لیکن دن رات کچرے میں رہنے سے اب وہ پچپن، چھپن سال سے بھی کہیں آگے کا لگنے لگا تھا۔

سردی ہو یا گرمی، آندھی ہو کہ طوفان اس کے معمولات میں کبھی کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ ٹھیک آٹھ بجے وہ اس محلے کے گھروں کی بیل بجانا شروع کرتا اور اپنی کچرا ٹرالی میں لگے مختلف تھیلوں میں کچرا ڈالنا شروع کرتا۔ لوگوں کے پھینکے گئے کچرے کو ایک بڑے سے تھیلے میں ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ بہت مہارت سے کچرے کو چھان کر الگ کرتے تھے۔ اس مشقت کے نتیجے میں اکثر کچھ کام کی چیزیں بھی اس کے ہاتھ لگ جاتیں۔

اس بڑے تھیلے کے علاوہ ایک تھیلے میں پلاسٹک کا سامان، تو دوسرے میں کانچ کی بوتلیں اور تیسرے تھیلے میں لوہے اور پیتل کی چیزیں جو کبھی کبھار قسمت سے لوگوں کے پھینکے گئے کچرے میں سے نکل آتی تھیں۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے محلے کے لوگ عموماً لوہے اور پیتل کی چیزیں جمع کر کے محلے کے ہی پرانے کباڑی امجد کو بیچ دیتے تھے اور نتیجتاً ڈینئیل تک چھانٹا ہوا کچرا ہی پہنچتا تھا۔ کبھی اگر کوئی ایسی چیز اس کے ہاتھ لگتی تو اسکی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہتا تھا۔ کچھ دنوں میں جب یہ کچرا جمع ہو جاتا تو وہ اسی جمع شدہ کچرے کو امجد کباڑی کو بیچ ڈالتا، کچھ پیسے مل جاتے جو مہینے بھر کی محدود تنخواہ میں بونس کا ذائقہ دے جاتے۔

اس کے علاوہ عید تہوار پر محلے کے کچھ گھر اس کو سو، پچاس روپے عیدی کے نام پر

لبنیٰ مقبول

تھما دیتے تو اس کی بھی جیسے عید ہو جاتی۔ پھر وہ اگلے دن بیوی کو کہہ کر بڑے اہتمام سے گھر میں گوشت کا قورمہ پکواتا اور ساتھ سویوں کا سوکھا میٹھا بھی جس پر اسکی بیوی شالی کٹے ہوئے بادام اور پستے کی تہہ لگا دیتی۔

ڈینئیل کو یہ تو یاد نہیں تھا کہ وہ اس محلے میں کب آیا تھا اور کب سے اس نے یہاں کے گھروں سے کچرا اٹھانا شروع کیا لیکن ڈینئیل کی تمام عمر اسی محلے کا کچرا اٹھاتے گزری۔ ڈینئیل کی مخصوص کھانسی کی آواز سنتے ہوئے اس محلے کی پوری ایک پیڑھی جوان ہو چکی تھی۔ اکثر عورتیں تو اس کی کھانسی کی آواز سن کر ہی اپنے گھروں کا کچرا دروازے کے باہر رکھ دیتی تھیں اس محلے میں اکثریت متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی جو اپنی سفید پوشی کا خود اپنے اوپر ہی بھرم رکھنے کی کوششوں میں لگے رہتی تھی۔

ڈینئیل کی زندگی میں بس اتنے ہی رنگ تھے جتنا کہ لوگوں کے پھینکے گئے کچرے میں تھوڑی بہت اس کے کام کی چیزوں کے نکل آنے سے ہوتے تھے۔ برسوں میں جا کر اس کی ایک کمرے کی جھگی انہی رنگوں سے بھرتی گئی تھی۔ لیکن شومئی قسمت، یہ سب رنگ بھی اس کے لیے پھیکے ہی ہوتے تھے کیونکہ ان رنگوں کی شوخی پہلے ہی گھسنے کی حد تک استعمال کی جا چکی ہوتی تھی۔ ان ادھڑے رنگوں میں شیخ صاحب کا ٹوٹا ہوا بستر سرِفہرست تھا جسکے نیچے اینٹیں رکھ کر ڈینئیل نے اس کو سہارا دے دیا تھا۔ بستر کے بالکل برابر میں ایک ٹوٹا پھوٹا سا شوکیس تھا جو کلیم صاحب کے گھر سے نکال کر پھینکا گیا تھا۔ یہ شوکیس بھی شاید نہ پھینکا جاتا اگر ان کی بہو کے جہیز میں لائے ہوئے نئے شوکیس کو رکھنے کے بعد اس شوکیس کے لیے بھی کوئی مناسب جگہ ان کے گھر میں نکل آتی لیکن اُس نئے شوکیس کو رکھنے کے بعد اِس پرانے شوکیس کو، جو خود برسوں پہلے کلیم صاحب کی بیوی اپنے جہیز میں لائی تھیں، گھر میں مزید رکھنے کی جگہ ہی نہیں بچ رہی تھی۔ لہٰذا بادلِ نخواستہ اس پرانے شوکیس کو ڈینئیل کے حوالے کر دیا گیا۔

شالی اسی خستہ حال شوکیس میں اپنے گنتی کے چند برتن رکھ کر خوش ہو جاتی جو اکثر اوقات میں محلے کے گھروں سے ہی ڈینئیل کو دیے گئے تھے۔

شالی..... ڈینئیل کی بیوی لیکن انسان تھی نا، جب شوکیس میں برتنوں کی ترتیب، ان کی محدود تعداد کی وجہ سے ٹھیک سے نہیں بن

پاتی تھی تو پھر وہ ڈینئیل سے شکوہ کناں ہو کر پوچھ بیٹھتی۔

ڈینی!!!

کیا ہماری قسمت میں استعمال شدہ چیزیں ہی لکھی ہیں؟؟

کیا کبھی وہ وقت آئے گا کہ میں بھی کوئی ایسی چیز اپنے لیے پسند کر سکوں جو نئی ہو؟ استعمال شدہ نہ ہو؟

کب ہمارے سارے برتن سبزی والے رحیم داد کے گھر کے برتنوں جیسے اور ایک ہی ڈیزائن کے ہوں گے؟

ڈینئیل شالی کی یہ سب معصوم خواہشات سنتا اور سوچ میں پڑ جاتا کہ غریب کے پاس بھی کیا خواہشات کا حق باقی رہ جاتا ہے؟ ڈینئیل کو سوچوں میں گم دیکھ کر شالی سمجھ جاتی کہ ہمیشہ کی طرح ان سوالات کا جواب نہیں مل سکے گا اور شالی کو کبھی جواب کی توقع رہی بھی نہیں اس کو تو بس سوال کرنے کی عادت تھی، جو سوال کرتی اسی میں اس کو جواب خود بخود مل جاتا تھا۔

بدقسمتی سے شالی معذور بھی تھی۔ یہ معذوری پیدائشی نہیں تھی بلکہ پہلے بچے کی پیدائش کے موقع پر گھر میں ہی بچے کی ولادت کے وقت اناڑی دائی نے اس وقت نجانے کیا دیسی ٹوٹکے اور طریقے استعمال کیے تھے کہ بچہ دنیا میں آتے ہی پہلی سانس کھینچ کر یوں ساکت ہوا کہ اس کا کھلا منہ پھر لاکھ کوشش کرنے کے باوجود بھی بند نہ ہو سکا اور رہی شالی تو زیادہ خون بہہ جانے کے باعث اس کا نچلا دھڑ ہمیشہ کے لیے سن ہو گیا۔ اس زمانے میں علاج معالجے کی سکت نہ ہونے کے باعث، خیراتی ہسپتال میں علاج کرانے کے باوجود بھی اس نقصان کا ازالہ نہ ہو سکا اور شالی کی تو مہینے تک آباد رہنے والی کوکھ آہستہ آہستہ بنجر زمین میں تبدیل ہوتی گئی۔

اولاد نہ ہونے کی محرومی شالی کے اندر تک جا کر بیٹھ گئی تھی۔ شروع شروع میں بستی کی عورتیں اکثر اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھیں اور دوسری اولاد کے لیے مزید دیسی ٹوٹکوں اور مفت مشوروں سے نواز جاتیں۔ لیکن بانجھ دھرتی پر بادل تو آتے لیکن ان سے بری دو بوندیں ناکافی تھیں جو شاید سوکھی زمین کی حدت سے ہی بھاپ بن کر اڑ جاتیں۔

ڈینئیل کے کام پر جانے کے بعد شالی لکڑی کے تختوں اور ٹین کی شیٹوں سے ڈالی گئی عارضی چھت والے، ایک کمرے کے مختصر سے جھگی نما گھر کا کام نمٹاتی اور پھر خود کو بمشکل گھسیٹ کر دروازے کے پاس پڑی اس ٹوٹی کرسی تک لا کر اپنا سن وجود اس پر گرا دیتی اور پھر اکثر شام تک وہیں بیٹھی رہتی اور گلی میں بھاگتے دوڑتے ننگ دھڑنگ بچوں کو دیکھتے رہتی

یہاں تک کہ ڈینگیل اس کو اپنے کام سے واپس آ کر اٹھاتا اور اندر لے جاتا۔

ڈینگیل کیا ہوتا اگر ہمارا بچہ بچ جاتا تو آج وہ کتنا بڑا ہوتا۔ کام میں تیرا ہاتھ بٹاتا، گھر میں کچھ رونق رہتی۔

گلی کے ان بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہوتا......

اس دن بھی شالی کے چہرے پر ایک بار پھر یہ سب کہتے ہوئے اداسی کے گھنے بادل چھا گئے تھے۔

وہ ہر دو دن بعد حسرت سے ان بچوں کو دروازے سے باہر کھیلتے دیکھ کر ڈینگیل سے عموماً یہی سوال پوچھتی۔

پچھلے کئی برسوں سے ڈینگیل، شالی کے ان سوالوں کی ترتیب سے بھی اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا سوال کیا ہوگا اس کو پہلے سے ہی پتا تھا۔ لیکن ان سوالوں کے جواب میں ڈینگیل کے پاس عموماً خاموشی ہی ہوتی تھی۔

کیونکہ ڈینگیل کے پاس کونسا اپنی زندگی کے دوسرے سوالوں کا جواب تھا جو وہ ان سوالوں کا جواب شالی کو دیتا۔ نتیجتاً دونوں چپ کر کے لمبے شوربے جیسے بدمزہ سالن میں سوکھی روٹی کو ڈبو کر چبانے کی کوشش میں لگ جاتے۔ ڈینگیل کے لیے زندگی بھی بذات خود ایک بدمزہ سالن جیسے ہی تو تھی۔

ساری عمر دوسروں کا کچرا اٹھاتے اٹھاتے ڈینگیل کے لیے زندگی حقیقتاً کچرے جیسی ہی ہو چکی تھی۔ ایک روبوٹ کی طرح جو سارا دن تمام کام اسی ترتیب سے کرتا جو اس کے اندر فیڈ کر دیا گیا تھا۔ اتنے برسوں میں بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور نا ہی کسی تبدیلی کے آنے کا کوئی امکان نظر آ رہا تھا۔ جب کبھی رات کے کسی پہر صحن میں رکھی بان کی ڈھیلی چارپائی پر کھٹمل کے کاٹنے سے اس کی آنکھ کھلتی تو وہ ساکت لیٹے لیٹے نہ جانے کب تک، دوسرے لوگوں کی زندگی کا اپنی زندگی سے مقابلہ کرتا۔ لیکن اس مقابلے میں اس کو کبھی یہ سمجھ نہ آئی کہ زندگی اس کے لیے ہی استعمال شدہ کیوں بنی۔ ان گنت سوالوں کا جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے اکثر صبح کی سپیدی نمودار ہو جاتی اور وہ پھر کسی روبوٹ کی طرح اپنے کام پر نکل پڑتا جہاں کچرے جمع کرنے میں سارے سوال ذہن سے محو ہو جاتے۔

آج بھی وہ روٹین میں اپنے کام میں لگا ہوا تھا جب محلے کے ایک معزز گھر سے ایک بچہ بھاگا بھاگا اس کو بلانے آیا۔

کچرے والے...... کچرے والے!!!

پھولی اور بے ترتیب سانس کے ساتھ بچے نے اسکو اسکے جدی پشتی لقب کے ساتھ

پکارا...

ڈینیل نے کچرا چنا روک کر بچے کو دیکھا اور پوچھا کیا ہوا؟؟

وہ امی بلا رہی ہیں کچھ دینا ہے۔

اچھا آتا ہوں.....

ڈینیل اس گھر کا کچرا ابھی ابھی اٹھا کر ہی یہاں تک پہنچا تھا... اس لیے وہ سمجھ گیا کہ یقیناً کوئی استعمال شدہ چیز ملنے والی ہے جو کچرے کے ساتھ نہیں دی گئی کہ اس کی اہمیت کم نہ ہو جائے۔

کچرے کی ٹرالی ایک کونے پر کھڑا کر کے وہ اس گھر پر پہنچا۔

یہ احمد صاحب کا گھر تھا۔ احمد صاحب کا شمار محلے کے معززین میں ہوتا تھا اور وہ یونین کے صدر بھی تھے۔ بحیثیت صدر محلے کے مسائل تو انھوں نے شاید ہی کبھی حل کیے ہوں گے لیکن صدر کہلوانے سے ان کا سینہ ہمیشہ ہی فخر سے چوڑا ہو جاتا تھا۔

جی باجی.....

دروازے پر ہی احمد صاحب کی بیوی کھڑی تھیں جو ڈینیل کو آتے دیکھ کر دروازے کی اوٹ میں اسطرح کھڑے ہو گئیں کہ اب وہ ڈینیل کو آدھی ہی دکھ پا رہی تھیں۔

کچرے والے!!! آج صفائی میں یہ کچھ پرانا سامان نکالا تھا۔ کچرے میں نہیں دیا، دیکھ لو اگر تمہارے یا کسی اور کے کچھ کام آجائے تو، ورنہ پھر ویسے ہی لے جاؤ کوڑے دان پر رکھ دینا۔

احمد صاحب کی بیوی کی آخری بات سن کر ہی ڈینیل کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اس سامان میں شاید ہی اس کے کام کا کچھ نکلے گا۔ یقیناً سامان کوڑے دان پر پھینکنے کے لائق ہی ہوگا۔

یعنی آج اس اضافی کچرے کو کوڑا دان میں لے جا کر پھینکنے کے الگ چکر لگانے پڑیں گے.....

ڈینیل نے ٹوٹے پھوٹے سامان کو بیزاری سے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا۔

یہ بڑا کوڑے دان محلے سے متصل پارک کی عقبی گلی میں بنا ہوا تھا جہاں ڈینیل اپنی کوڑا ٹرالی خالی کرتا تھا۔ کبھی مہینوں میں جا کر علاقے کی قسمت جاگتی اور میونسپلٹی کا کوئی بڑا ٹرک آ کر وہاں سے کچرا اٹھا کر لے جاتا تو اس جگہ کی صفائی ہو جاتی لیکن اس دن پورا علاقہ تھے ہوئے سڑے کچرے کو اس کی جگہ سے اٹھائے جانے پر بسا مد بدبو سے سڑتا رہتا کہ سانس لینا تک دشوار ہو جاتی۔ اس لیے محلے کے لوگ کچرے کے نہ اٹھائے جانے پر ہی خوش اور مطمئن نظر آتے تھے۔

لیکن اسی بدبو اور غلاظت کی وجہ سے لوگ

اس گلی سے گزرنا تقریباً چھوڑ چکے تھے اور اگر کوئی بحالتِ مجبوری گزرتا تو اپنی ناک پر کپڑا رکھ کر ہی گزر پاتا۔

ڈینئیل عموماً سارا کچرا ٹرالی میں بھر کر سب سے آخر میں اس ٹرالی کو اس کوڑے دان پر خالی کرآتا تھا۔

درحقیقت، دن بھر کچرے میں رہنے کے باوجود بھی اس کو اپنے دن بھر کے سارے کام میں سب سے مشکل کام یہی لگتا تھا جب اس کو ٹرالی لیکر اس کوڑے دان تک جانا ہوتا تھا۔ کوڑا دان کیا تھا کالے پانی کی سزا تھی۔

محلے بھر کے کتے اور بلیاں ادھر اپنا رزق تلاش کرتی تھیں۔ اور انہی کتے بلیوں کی افزائشِ نسل کے لیے بھی یہ کوڑا دان بہترین جگہ تھی۔ اکثر شام کے اوقات میں چیلوں کے جھنڈ بھی ادھر آکر گول گول چکر لگاتے تھے۔

ایسے وقت میں ہر شخص اپنا سر بچاتا ہوا دور سے ہی راستہ بدل لیتا تھا۔

موسم بدل رہا تھا، فضا میں ہلکی ہلکی سی خنکی آچکی تھی۔ اس دن بھی حسبِ معمول ڈینئیل کی آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔ کل اس کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے اس نے چھٹی کی تھی۔ ایک دن کا آرام اب اس کو ڈبل کام کی صورت میں دینا تھا۔ یعنی ہر گھر سے دو دن کا کچرا اٹھانا تھا۔ اسی سوچ کے ساتھ اس نے جلدی کام پر جانے کا سوچا تاکہ دوپہر تک دھوپ کی شدت میں اضافے سے پہلے ہی اس کا سارا کام نمٹ جائے۔

جلدی جلدی رات کی روٹی کے ساتھ اچار کھا کر وہ کام پر نکل پڑا۔ شالی مست سو رہی تھی۔

ویسے بھی شالی کو جلدی اٹھ کر کرنا بھی کیا تھا۔ کونسا بچوں کے دس کام اس کے ذمے لگے تھے جو اس کو فکر ہوتی۔ ڈینئیل کی فکر تو اس نے عرصے پہلے ہی کرنا چھوڑ دی تھی۔

بہرحال محلے میں پہنچ کر اس نے معمول کے مطابق گھروں کے باہر رکھا ہوا کچرا ٹرالی میں ڈالنا شروع کیا۔ جن گھروں کے باہر ابھی کچرا نہیں تھا ان کی ڈور بیل اتنی جلدی بجانا مناسب نہیں تھا اس لیے اس نے وہ گھر دوسرے چکر کے لیے چھوڑ دیے۔ جلد ہی ٹرالی منہ تک بھر گئی کیونکہ گھروں کے باہر دو دن کا کچرا جمع تھا جن میں بساند بو اور مکھیاں پیدا ہو چکی تھیں۔

اپنے گھروں کو اندر سے صاف کرنے والے کچرا صرف بند تھیلی میں ڈالکر کر باہر رکھ دیں تو ان کا کیا جائے گا۔ دو لمحے کے لیے ڈینئیل نے سوچا اور پھر سر جھٹک دیا، وہ تو ایک جاہل سا کچرے والا تھا اور یہ سب سوچنا اس کا کام تھوڑی تھا۔

صبح کی سپیدی اچھی طرح نمودار ہو چکی تھی۔ چیزیں واضح دکھ رہی تھیں۔ بھری ہوئی ٹرالی لیکر اب وہ کوڑے دان کے قریب پہنچ چکا تھا، تبھی اسکو ایک نسوانی ہیولہ بہت تیزی سے کوڑے دان کے قریب سے نکل کر پارک کی طرف گلی میں جاتا ہوا دکھائی دیا۔ کوڑے دان کے اتنا نزدیک سے کسی کا اس گلی کی طرف جانا ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ یہ گلی آگے سے بند تھی۔ فجر کے بعد، علاقے کے اکثر لوگ پارک میں جوگنگ بھی کرتے تھے لیکن پارک کا دروازہ بھی بالکل مخالف سمت میں تھا اس لیے بظاہر ادھر اتنے کچرے میں کسی کا نظر آنا ڈینئیل کے لیے بڑی حیرانی کی بات تھی۔

ڈینئیل ابھی اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ ایک بڑی سی گاڑی بہت تیزی سے اسی بند گلی سے نکلی اور پارک کے ساتھ گلی سے ہوتی ہوئی مین روڈ کی طرف نکل گئی۔ کالے شیشوں والی گاڑی میں کچھ دیکھنا ممکن نہیں تھا، لیکن سامنے سے چند سیکنڈز کی جھلک میں ڈرائیونگ سیٹ پر وہی نسوانی ہیولہ نمایاں تھا۔

کون ہوگی یہ؟؟

کیا وجہ ہوگی؟؟؟

ڈینئیل جانتا تھا کہ اس قیمتی گاڑی کو چلا کر لے جانے والی جو بھی تھی بہر حال اس علاقے کی تو نہیں تھی..... کیونکہ اس علاقے میں لڑکیوں کی اکثریت آنے جانے کے لیے عموماً موٹر سائیکل پر اپنے والد یا بھائیوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے ہی نظر آتی تھیں۔ گاڑی خود چلانے کے وہ صرف خواب دیکھ سکتی تھیں۔

گاڑی ڈینئیل کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

ہنہ!!!! بڑے لوگ بڑی باتیں!!!!

یہ سوچتے ہوئے ڈینئیل نے کچرا ٹرالی کوڑے دان کے قریب الٹ دی اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ آج کام بہت تھا۔ بے حساب کچرا جو گھروں کے باہر اس کا منتظر تھا۔ ابھی تو دو سے تین گلیوں کا کچرا اٹھایا تھا۔

پندرہ سے بیس منٹ میں اس کی کچرا ٹرالی کی دوسری قسط تیار تھی جو اس کو کوڑا دان پر لے جا کر خالی کرنا تھا۔

کوڑا دان کی طرف اب یہ اس کا دوسرا چکر تھا......

ابھی نزدیک ہی پہنچا تھا کہ اس کو کچھ غیر معمولی سا احساس ہوا۔ لاتعداد کوے اور چیلیں آوازیں نکالتے ہوئے بے قرار سے کوڑے دان پر گول گول چکر لگا رہے تھے۔ اس کو کوڑے دان کے اندر ہلچل سی محسوس ہوئی اور اسی ہلچل کے ساتھ اس کو کوڑے دان کے اندر سے دو عجیب و غریب سی ملی جلی آوازیں آئیں۔

پہلی آواز نہایت باریک، نازک منحنی سی، کسی شیر خوار بچے کی اور دوسری کتے کے غرانے اور بھنبھوڑنے کی...... جیسے اس کو اسکا من پسند کھانا مل گیا ہو اور وہ کسی رکاوٹ کے باعث کھا نہیں پا رہا ہو۔

لمحہ لگا ہو گا ڈینکیل کو سمجھنے میں کہ اندر کیا معاملہ ہو گا۔ نالی میں پڑا ہوا موٹا سا ڈنڈا اٹھا کر اگلے ہی لمحے وہ کوڑے دان کے اندر تھا۔ وہ کوڑا دان جس میں کچرے کی بہتات کی وجہ سے مہینوں میں ہی شاید اس کا داخلہ ہوتا تھا جب میونسپلٹی کی گاڑی ادھر کچرا اٹھانے آتی اور کچرا لے جاتی تھی اور یہ کوڑے دان کچھ خالی ہو جاتا تھا۔

کوڑے دان میں ڈینکیل کے ڈنڈے سمیت داخلے پر علاقے کا وہ موٹا تازہ کتا جو منا قصائی کی دکان پر گوشت اور چھچھڑے کھا کر پڑا ہوا تھا، جیسے بادل ناخواستہ اپنا شکار چھوڑ کر بھاگا اور کوڑے دان کے باہر کچھ فاصلے پر غراتے ہوئے اس امید پر کھڑا ہو گیا کہ ڈینکیل کے جاتے ہی شاید اس کو اپنا تازہ اور ملائم شکار واپس مل جائے۔

اس کے دانتوں میں تو ابھی کپڑے کا وہ ٹکڑا پھنسا ہوا تھا جو یقیناً اس کے اور اس شیر خوار بچے کے بیچ حائل ہوا تھا۔

کچھ گھنٹوں قبل پیدا ہوا انسانی بچہ...... جسکے جسم پر جا بجا پیدائشی خون اور گندگی لگی ہوئی تھی جو کہ اتنی دیر ہوا لگنے سے تقریباً خشک ہو کر بچے کی نازک جسم پر چپکی ہوئی تھی۔ معصوم بچہ جو ابھی ٹھیک سے رو بھی نہیں پا رہا تھا۔ جسکا اس دنیا میں ماں کے لمس کی خوشبو کے بجائے گندے، سڑے ہوئے بدبودار کچرے نے استقبال کیا تھا۔ یہ شیر خوار بچہ ماں کی نرم گرم آغوش کے بجائے کتے کے خونخوار دانتوں کی بھینٹ چڑھنے جا رہا تھا۔ جو یقیناً بعد میں اوپر اڑتی چیلوں اور کووں کا ناشتہ بنتا۔ بچے پر لپٹے ہوئے موٹے تولیے نے یقیناً اس کو ان وحشی دانتوں سے کچھ وقت کے لیے محفوظ رکھا تھا۔ اگر ڈینکیل کے ادھر پہنچنے میں پانچ منٹ کا بھی وقفہ ہوتا تو شاید کوڑے دان میں، اس کچرے کے ڈھیر سے زندہ بچے کے بجائے اس کی ادھڑی ہوئی لاش برآمد ہوتی۔

ڈینکیل نے سرعت کے ساتھ بچے کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس ٹھنڈے موسم میں انسانی جسم کی گرمی اور آغوش ملتے ہی وہ بچہ خاموش ہو گیا لیکن اس کی گھٹی گھٹی سسکیاں مستقل جاری تھیں۔

ساتھ ساتھ بچے نے اپنا ہاتھ اور انگلیاں منہ میں لے کر چوسنا شروع کر دی تھیں۔ بچہ بھوکا تھا۔ یقیناً ماں کی آغوش تو اس معصوم کو

کیا نصیب ہوئی تھی، اس کو دو قطرے دودھ
بھی نہیں پلایا گیا تھا۔
اس بچے کا کیا کرنا چاہیے؟؟
کیا کسی کو بتانا چاہیے؟؟
یہ بچہ اس علاقے کا تو نہیں، یہ تو طے تھا۔
کیا کروں اس بچے کا؟
کیا اس کو ایدھی ہوم کے جھولے میں ڈال
آؤں؟
اگر مجھ پر ہی تو مولود کے اغوا کا الزام لگ گیا
تو؟؟
کوڑے دان کے باہر کھڑے
دشکیل کے دماغ میں مختلف جملے اور
آوازیں گونجنا شروع ہو گئی تھیں۔
دشکیل کیا ہوتا اگر ہمارا بچہ آج زندہ ہوتا۔
ہمارے گھر میں بھی رونق ہوتی۔
تیرے کام کاج میں تیرا ہاتھ تو بٹاتا۔
شالی کے حسرت بھرے سوال اس کے
کانوں میں گونجنا شروع ہو گئے۔
باہر دور دور تک کوئی ذی نفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ صبح
صبح کوڑے دان کی طرف سے نسوانی ہیولے اور
شاندار گاڑی کے تیزی سے نکل کر جانے کا
معمہ اب کافی حد تک حل ہو چکا تھا۔
یقیناً آج کسی امیر زادی نے اپنی اندھیری
رات کے سیاہ اعمال کا کچرا نو مہینے تک مجبوراً
استعمال کرکے جان چھڑانے کے واسطے اس
کوڑے دان میں لا پھینکا تھا، جو یقیناً اب
اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔
ماں کی سفاکی عیاں تھی۔ یقیناً اس کو اس
بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ یہ بچہ جیے یا
مرے، یا پھر چیل، کووں اور کتوں کی
خوراک بنے۔
کچرا تو کچرا تھا اب چاہے وہ لوگوں کے
گھروں کا کچرا ہو یا ناجائز تعلقات کے
نتیجے میں جسم میں پلنے والا کچرا جس کو پھینک
کر اپنا گھر اور اپنا جسم صاف کر لیا جاتا ہے
اور کچرا تو بہرحال دشکیل نے ہی اٹھانا تھا
تاکہ یہ علاقہ صاف رہے۔
بس یہی سوچ کر، ٹرالی وہیں چھوڑ چھاڑ،
بچے کو مضبوطی سے اپنی آغوش میں بھینچے،
اگلے ہی لمحے دشکیل کے قدم تیزی سے
اپنی جھگی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بچے کی
صورت اُسے شالی کے پوچھے گئے سارے
سوالوں کا جواب مل گیا تھا، جو وہ برسوں
سے نہیں دے پایا تھا۔
آج دشکیل بہت خوش تھا کیونکہ اس کو آج
کچرے سے لوگوں کی استعمال شدہ بے کار
چیزوں میں سے اب تک کی سب سے قیمتی
چیز جو مل گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

نامکمل بصارتیں

سیدہ صائمہ کاظمی

بختا کھیتی چننے کھیت میں پہنچا تو اس کے کندھوں پر کئی بورے لدے تھے۔ جو تیار شدہ فصل سے بھر جانے تھے۔ کچھ اپنی اور باقی جو مزدوری پر اس نے حاصل کی تھیں۔ اس نے تہبند سنبھالی اور کدال کے دستے پر گرفت جمائی۔ اس کے مشاق ہاتھ کدال کی نوک سے دھرتی کا سینہ چیرتے چلے جاتے۔ اور زمین کی آغوش میں چھپی فصل کو جڑ سے نوچتے چلے جاتے۔ بختے کی اراضی کوئی ایکڑوں نہیں پھیلی تھی۔ بس یہی کوئی سو قدم کم ایک مرلے، جس پر ادرک بوئی گئی تھی۔ وہ تیزی سے اپنا کام نمٹاتا چلا جا رہا تھا۔ ہڈیوں میں گھس جانے والی ہوا بدن کا ریشہ ریشہ کھنگال رہی تھی۔ اور اس کے ہاتھ زمین سے اپنی محنت کا خراج وصول کیے جاتے تھے۔ وہ خوش تھا کہ اس بار کھیتی اچھی رہی تھی۔

دانہ، پانی، دوا، دارو۔ سب اس نے قرض لے لے کر پورا کیا تھا۔ مگر حاصل شدہ مال دیکھ کر لگتا تھا۔ سارا خرچہ وصول ہو جانے والا ہے۔ اور اگلی فصل کھڑی کرنے کے لیے مزید قرضہ نہیں لینا پڑے گا۔ اس کے جوش میں اضافہ ہو گیا اور زمین کھودنے کی رفتار مزید تیز ہو گئی۔

پو پھٹنے سے لے کر دن چڑھنے تک وہ مشین کی طرح کام میں جتا رہا۔ اور اس کی امیدیں چڑھتے سورج کے ساتھ سوا ہوتی رہیں۔ مگر آدھی زمین کھودنے کے بعد---- اس کی کدال نے جو پودا نکالا---- اس نے بختے کی امیدوں کا پانی اس کے کھڑے ہر مسام میں بہا دیا۔

آدھی فصل کے بعد جو پہلا ادرک نکلا وہ عام ادرک کی بہ نسبت کچھ بڑا تھا اور شاید طفیلی تھا۔ ابھی وہ زمین سے پورا برآمد بھی نہیں ہوا تھا کہ بختے کی امیدوں کے پر دور دور تک پھڑ پھڑائے۔ ان پروں کی ہوا نے چرند پرند کو بھی گھونسلے چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ان کی حیرت زدہ آنکھیں بختے کی زمین پر لگ گئیں۔ بختے کی طرح موجودات میں تمام اشیاء اس عجوبہ کو دیکھنے کے لیے بیتاب ہوئیں۔ آخر دھرتی کی گود سے کیا برآمد ہونے والا ہے؟ جس نے زمین میں اتنی گہری جڑیں گاڑ لی ہیں کہ بختا زمین کو مسلسل کھودتا چلا جا رہا ہے۔

موجودات کی آنکھیں اس مسلسل بڑھتے گڑھے پر جم گئیں۔ جو باقی ماندہ فصل کی

حیات کے لیے اب خطرہ بنتا جا رہا تھا۔ بات تو بختے کو بھی سمجھ آ رہی تھی۔ اس نے رک کر سانس بحال کیا۔ اور ذرا دیر کو سوچا۔ اگر وہ یونہی زمین کھودتا چلا گیا تو یہ گڑھا باقی فصل کو بھی نہ کھا جائے؟ وہ شش و پنج میں مبتلا تھا کہ نفس نے صدا دی۔

"میرے پاس بہت فصل ابھی باقی ہے۔ باقی ماندہ فصل کو ایک آدھ خراش نے چھو بھی لیا تو کیا؟ منڈی میں ایک اس دانہ سے ہی سارا حساب وصول ہو جائے گا"۔

اور نفس کی آواز پر لبیک کہہ کر کدال تھام لی۔ کہ چھوٹے اوزاروں کی سکت اس ایک دانے کے سامنے جواب دے چکی تھی۔

دن اختتام کو پہنچا اور بختا اوزاروں سمیت فصل سے بھرے بورے سمیٹ کر کھیا پر پڑ رہا۔ فصل بونے سے فصل اکٹھی کرنے تک کے تمام مراحل بہت صبر آزما ہوتے ہیں۔ یہ چار دن کی کہانی نہیں۔ موسموں کا تغیر۔ خوراک کی فراہمی۔ خون کو پانی بنا دینے والے رات دن۔ سب ملتے ہیں تو ایک دانہ پھوٹتا ہے۔

نیا دن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ بیدار ہوا۔ بختا ایک بار پھر اس گڑھے پر موجود تھا۔ جہاں اس کی ساری محنت کا حصول تھا۔ مگر نئے دن کا سورج اپنے ساتھ بختے کے لیے ایک معمہ بھی ساتھ لیے ہوئے تھا۔ وہ عجوبہ جس کے لیے اس نے آدھی زمین چیر ڈالی تھی۔ اپنی جڑوں کے قریب پہنچ کر سیاہ پڑ چکا تھا۔ اور حد تو یہ تھی کہ اس سے جڑی آدھی فصل تباہ ہو گئی تھی۔ اس مٹی میں اب کوئی اور بیج نہیں بویا جا سکتا تھا۔ کسان کو اس کا وجدان ادراک دے چکا تھا۔ یہاں سے فصل ہی نہیں زمین کو بھی کیڑا لگ چکا تھا۔

بختے نے شہادت کی انگلی سے ماتھے پر جگمگاتا پسینہ رگڑ کر صاف کیا۔ چہرے کو اپنے میلے دامن سے پونچھا اور جڑ کو شاخ سے علیحدہ کر کے اسے بھی منڈی کے لیے تیار بورے میں ٹھونس دیا۔

"کوئی بات نہیں۔ دوسری فصل کے ساتھ تول میں کچھ دام تو اس کا بھی لگ ہی جائے گا۔ باقی جو اللہ کو منظور!"

اس نے خود کو تسلی دی۔ اور ادرک سے بھرے بورے گدھے کی پشت سے جڑے لکڑی کے تختے پر احتیاط سے لادنے شروع کیے۔ مبادا اسے کوئی اور نقصان اٹھانا پڑے۔

آڑھتی نے ایک ایک بورے کے نرخ لگانا شروع کیے اور ہر بورے کو گودام میں رکھوانا شروع کیا۔ ساتھ ساتھ مزدور ہر بورے کو زمین پر پھیلا کر عرق بنی بھی کرتے جاتے۔ ایک بورا ایسا بھی تھا جو غیر معمولی پھولا ہوا تھا۔ بہت سے ادرک کے ساتھ اسی میں وہ "عجوبہ" بھی تھا۔ جس کے لیے بختے نے آدھی زمین اجاڑ ڈالی تھی۔

ٹھیکیدار نے اس عجوبے کو الٹ پلٹ کر اچھی طرح جائزہ لیا۔ اور پھر اس کے نصف کیڑا

زدہ حصے کو نشان زد کر کے اس کی آدھے سے بھی کم قیمت لگاتے ہوئے اسے گودام کی نذر کر دیا۔

بچتا اسی پر شکر گزار ہوا اور نرخ کھرے کر کے نیا بیج خریدنے آگے چوک بڑھ گیا۔ ٹھیکیدار سے گودام۔ گودام سے منڈی۔ اور منڈی سے گاہکوں تک۔ وہ عجوبہ نرخ در نرخ سفر طے کرتا رہا۔ اور ہر ایک اپنا دام کھرا کرتا رہا۔ مسلسل گرتی قدر اسے ایک بار پھر غریب کے نعمت خانے تک لے گئی۔ ناک میں موٹی لونگ والی عورت نے ایک نظر اس عجیب مگر جثے میں بڑے ادرک کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اتنا بڑا ادرک اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سمجھ نہیں آتا تھا۔ شوہر کی عقل کو کس برتے پر کھے؟ ایک طرف سے تازہ، ہرا بھرا اور بے داغ ادرک۔ جبکہ دوسری طرف سے قطعی، سیاہ اور داغدار۔ صاف اس کے کیڑا زدہ ہونے کو ظاہر کرتا تھا۔ خدا جانے اس کے جثے (شوہر) نے کون سی آنکھ پائی تھی کہ اسے ادرک کا یہ خراب حصہ کیوں نہ دکھائی پڑا؟ یقیناً اپنی بیڑی کے چار پیسے ہی بچائے ہوں گے۔ ایک وقت کا کھانا ملے نہ ملے۔ بیڑی ضرور (ضرور) ملے۔

وہ شوہر کو کوستی ادرک کی صفائی کرنے بیٹھی۔ پہلا چرکہ ہی اتنا گہرا پڑا کہ خون کی ننھی سی بوند اس کی انگلیوں میں بہہ گئی۔ اس نے گھبرا کر چیخ ماری۔ دانہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ چیخ سن کر گھر کے سب افراد جمع ہو گئے۔ "ادرک میں ننھا سا بچہ!" جو کروٹ کے بل، آنکھیں موندے ہوئے تھا۔ دنیا کے قہر سے بے نیاز۔ یہ واقعی ایک عجوبہ تھا۔ قیامت کے خوف سے سب کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں۔ پہلے آس پڑوس میں بات پھیلی۔ پھر پولیس تک پہنچی۔ اور میڈیا کے ذریعے پھیلتے پھولتے ملک کے ہر کونے اور پوری دنیا تک پھیل گئی۔

ہاں! وہ واقعی بچہ تھا۔ ادرک کا جنا ہوا انسانی بچہ! مگر ادھورا۔ اس کی ناف بڑے بڑے ڈاکٹروں نے علیحدہ کی۔ جو ادرک کی کناروں سے ہری اور سروں سے کمزور اور گلی سڑی جڑ کے ساتھ جڑی تھی۔ ناخواندہ عورت کے ہاتھ سے لے کر وہ عجوبہ لیبارٹریوں میں منتقل ہو گیا۔ دنیا کے بڑے بڑے دماغ سر جوڑ کر بیٹھ گئے ان کے سامنے کئی سوال تھے کہ "آخر یہ کیوں کر ممکن ہوا؟ یہ بیج کس نے بویا؟ کیا ادرک کے ساتھ بھی زیادتی ہوئی تھی؟ کہاں ہوئی؟ ڈی۔این۔اے کس کا ہے؟ بلڈ سیمپل کیا کہتا ہے؟ جنس کیا ہے؟ بال دیکھو۔ کھال دیکھو"----

ماہرین سوال در سوال کھڑے کرتے اور آپس میں ہی الجھتے جاتے۔ جبکہ کسان بیمار زمین میں نیا دانہ بو رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

ماسک

سڑک پر چلتے چلتے میری نظر ایک بار پھر آسمان کی طرف اٹھ گئی۔ میں آج تک اپنی اس عادت پر قابو نہیں پا سکی ہوں کہ میں جس زمین پر چل رہی ہوں، اس کے آسمان کو ضرور دیکھتی ہوں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا کا ہر آسمان ایک جیسا ہوتا ہے، پوری طرح طاقتور، جسے کسی ستون کی ضرورت نہیں۔ خوش ہو تو بارش اور جلال میں آئے تو ظالم زمین پر سنگ باری بھی کرتا ہے۔ مخلوق کو گمان ہے کہ آسمان والے نے اپنے تعلقات صرف اسی کے ساتھ رکھے ہوئے ہیں لیکن اسے وہ کچھ یاد نہیں ہے جس کی بے زبان فریاد پر آسمان نے زبان دراز بستی کو آناً فاناً تہس نہس کر ڈالا تھا۔ ویسے میں موسم دیکھنے کے لیے آسمان کو نہیں کھوجتی، مجھے اس کے پھیلاؤ میں غیب نظر آتا ہے۔ غیب میں بہت پراسرار کہانیاں ہوتی ہیں اور مجھے پراسراریت سے عشق ہے۔ میں اسی لیے وباؤں پر بھی غور کرتی رہتی ہوں۔ میرا کشف کہتا ہے کہ یہ آسمانی پراڈکٹ ہیں، زمین والوں کے لیے جھٹکا ہوتی ہیں لیکن زمین والے اسے کیمیاوی آمیزش سے موت بنا دیتے ہیں۔

میں ان دنوں جس زمین پر چل رہی تھی، وہ اس زمین وبا کی جنم بھوم تھی۔ میں اپنی بہن اور نوعمر بھانجی سے ملنے اس کے دیس گئی تھی، جب اس کارستانی کی زد میں آ گئی تھی۔ اس زمین کے لوگوں نے پہلے تو مجھے پکڑا اور پھر قرنطینہ کر دیا۔ اکیس روز کے بعد جب میں کلیئر ہوئی تو اکیلی نہیں تھی، ماسک اور دستانوں کے ساتھ نمودار ہوئی تھی، مگر میں نے آسمان کو دیکھنا نہیں چھوڑا تھا۔

اس دوران میری بوریت اور ذہنی محرومی دور کرنے کی غرض سے میری جینئس بھانجی میرے ساتھ جوڑ دی گئی تھی۔ میں تو اسے ایک عام بچی سمجھنا چاہتی تھی لیکن وہ بلا کی خاص تھی۔ کمرے میں گلوب کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے کہا

خالہ..... یہ وائرس انسان کی مرضی سے اوپر والے نے بھیجا ہے۔ زمین پر رہنے والے ایک دوسرے سے دور ہونا چاہتے تھے۔ اپنے اپنے ماسک اور اپنے اپنے دستانوں میں، خفیہ رہنا چاہتے تھے۔ انھیں دوسروں سے بدبو آتی تھی۔ جان بوجھ کر دوسروں سے فاصلے پر رہتے تھے۔'' اس نے طنزاً کہا

فرخندہ شمیم

لیکن...... قریب بھی تو آتے تھے۔ کسی کام کسی اپنائیت کے لیے۔“ میں نے چھوٹی عمر کی بچی کا ذہن بنانا چاہا۔

”آتے تھے مگر صرف عارضی عرصے کے لیے“ میں پسینے پسینے ہوگئی۔

بھانجی نے بے نیازی سے گلوب کا جسم گھما دیا، اس کے دونوں ہاتھوں میں سفید دستانے تھے۔

دیکھیں خالہ..... میں اب گلوب پر آپ کو وہ ملک دکھاتی ہوں جس میں وبا نہیں ہے۔

اس نے ایک براعظم پر انگلی رکھی۔

یہاں کئی ملکوں میں وائرس نہیں ہے، اب بھی! کیا احتیاط اس کی وجہ ہے، کیونکہ دیکھیں تو ابھی تک کہیں ایجاد نہیں ہوئی ہے؟

”جی ہاں، لیکن..... تاریک براعظم کے ان لوگوں نے وحشت کی بو وقت پر سونگھ لی تھی۔ زمینی حقائق کو سمجھ گئے تھے۔ بنی اسرائیل کی طرح تو معجزوں کے منتظر نہیں تھے“

میں نے پہلی بار بڑے تعجب سے بھانجی کو دیکھا اور پھر اپنی بہن کو سراہا جس نے تاریخ کا اس قدر شعور اپنی بیٹی کو دیا تھا۔ لیکن بھانجی، ایک نظریہ اور بھی ہے، وبا کی وجوہات کا“

میری بھانجی اب گلوب کے اوپر کی مٹی جھاڑ رہی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ مذہب سے دوری اس کی وجہ ہے؟

مذہب نہیں۔ دین سے دوری کہیے۔

کیونکہ، دین ڈسپلن سکھاتا ہے کہ چمگادڑ سانپ اور چھپکلی کھانے کے لیے نہیں ہوتے ہیں۔ تو پھر یہ وبا ان خطوں میں کیوں اور کیسے پہنچی؟ یہاں تو ایسا کچھ نہیں کھایا جاتا۔

میں نے گلوب کے ایک حصے پر اشارہ کیا

خالہ..... یہاں عیاشی کھائی جاتی ہے، سر سے پاؤں تک چادر میں لپیٹ کر۔ بھوکوں کے سامنے رکھی جاتی ہے۔ مقدس کتاب کو الماری کے سب سے بلند خانے میں تہہ کر دیا گیا ہے۔ جرنیل اعظم سے چھپا کر لیکن ...... کیا یہ سالار اپنی فوج کے سپاہیوں کی نقل وحرکت کو نہیں جانتا ہے؟

میری بھانجی پر تبلیغ سوار تھی۔ میرا دل گھبرانے لگا میں نے بھانجی سے کہا“

کھڑکی کھول دو۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے مجھے آسمان کو دیکھنا ہے۔

آسمان مصروف ہے خالہ..... زمین کے لیے ماسک ڈھونڈ رہا ہے

کیوں؟ ماسک پہن تو رکھے ہیں سب نے۔ میں نے جھنجھلاہٹ سے کہا

یہ ماسک کافی نہیں ہے اس ماسک سے صرف وائرس بچ سکتا ہے وبا نہیں۔ وبا تو بدن کے اندر ہے نا۔ آسمان نے ابھی بہت جراثیم دھونے ہیں۔ خالہ۔ اور اس دھلائی میں اسے کسی ماسک کی ضرورت نہیں، وہ بے نیاز ہے ماسک کی ضرورت صرف دنیا کو ہے۔

یہ کہتے ہوئے میری بھانجی نے ایک بڑا سا کپڑا گلوب کے اوپر ڈال کے اسے اندھا کر دیا تھا۔“

☆☆☆☆☆

سفید گلاب: دو ایک باتیں

جمیل احمد عدیل

محمود ظفر اقبال ہاشمی پر فکشن کا در دلکشا پہلی بار: 'سفید گلاب' کی صورت میں کھلا تھا، یوں ناول کے قارئین دفعتاً کچھ دم بخود سے ہو کر رہ گئے تھے کہ اچھا! اعلا مستقل انسانی قدروں کو ایسی سچائی، سادگی، صفائی اور سلاست کے ساتھ بھی بیان کیا جا سکتا ہے؟ درحقیقت وہ متعجب اس لیے تھے کہ انتقادیات سے منسوب دانش میں صدق کی پیش کش میں ذہنی تحفظات کا عمل چپکے چپکے شامل ہوتا رہا تھا اور اس کی دو اساسی وجوہ تھیں: ایک تو یہ کہ سچ کی اعلانیہ شکل فن کے منافی ہے؛ دوسرے یہ کہ سچ زیادہ سے زیادہ ایک Abstract Truth ہے؛ سادہ لفظوں میں سچ مطلق نہیں اضافی ہوتا ہے۔ اب یہ اصول سازی کچھ ایسے مرتب انداز، سلیقہ مندی اور تمکین سے اسلوب میں سامنے لائی گئی تھی کہ اس سے دستبرداری کی بابت سوچنا بھی نئے ذہن کو تنہا کرتا تھا چنانچہ جدید مدرک تخلیق کو تجرید سے منسلک رکھنے پر مجبور تھی نیز بے سمتیوں کی کشادگیوں میں سمت کو مفقود دیکھنے / دکھانے کی ایسی خوگر ہوئی کہ زندگی سے وابستہ کوئی زمینی کلیہ، کوئی آسمانی رہنمائی اس کی نگاہ میں

حتمی نہ رہی۔ ظاہر ہے علمی/فکری ادعائیت کے اپنے 'داخلی معروضی' تقاضے موثر ہونے پر مصر رہتے ہیں!

اس صورت حال میں مزید ستم یہ ہوا کہ فکشن میں جب پورے لاوڈ کے ساتھ 'منشور' کو برتا گیا تو مذکورہ بیانیہ اور قوت پا گیا کہ: دیکھ لیجیے! کیا یہ ناول ہے؟ کیا یہ افسانہ ہے؟ نرا پرا چند نامہ، سراسر سرمن، بھرپور پروپیگنڈا !!! یہ طرز فکر ایسا کہنے میں کافی حد تک حق بجانب اس لیے بھی تھا کہ واقعتاً متذکرہ فکشن پہلے سے تدوین کیے گئے نظریات کا محض پیشکار تھا یعنی سیدھے سبھاؤ ناول/افسانے کو 'استعمال' کیا گیا تھا، لیکن تنقید میں جارویی بیان داغنے یا فیصلہ صادر کرنے کی اصولی گنجائش بہرحیث محدود تر امکانات ہی رکھتی ہے۔ سو، وہ سچ جو بنیادی طور پر فکشن سے پھوٹتا ہو؛ اس کے کرداروں نے اپنی کوکھ سے اسے جنم دیا ہو؛ جس کی تفکیر صرف متن میں اسیر نہ ہو بلکہ اس کی ہیئت کی کلیت کے ساتھ نامیاتی ناتا رکھتی ہو؛ اسے استرواد کے سپرد کر دینا صریح ناانصافی ہوگی! اس ضمن میں لطیف جہت غالباً اس استفہام میں پنہاں ہے کہ مخصوص ناول/افسانے کے راوی کا کردار کس حیثیت کا مالک ہے؟ کیا اس نگارش کی حد تک وہ عین مین اسی سچ کی نمایندگی کر رہا ہے، آگے چل کر جس نے مکمل بیانیے پر محیط ہونا ہے؟ 'سفید گلاب' کی خواندگی کے دوران بطور قاری راقم کو اعتبار آتا چلا گیا کہ مصنف نے اس ناول کے راوی کی جستجو پر ایک مدت صرف کر ڈالی ہے؛ اسے تلاش کیا گیا ہے؛ اسے 'تخلیق' نہیں کیا گیا کیونکہ جب ناول نگار راوی کو 'گھڑتا' ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ راوی کوئی خودمختار وجود رکھتا ہے یا مصنف ہی کو پیش کرتا ہے! محمود ظفر اقبال ہاشمی کو سچ پر ایسا محکم بھروسا کرنے والا راوی کہاں سے ملا ہے؟ یہ ایک راز ہے! اپنے طبعی تجسس کے باوجود ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ان سے اس سریت کی مناسبت سے، بے نقابی پر اصرار کریں! لیکن کیا ہے کہ 'مریم سلمان' کے کردار کی حیران کن طاقت سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی غلطی سرزد نہیں ہوگی کہ جس بھی راوی نے اسے تراشا ہے، اس میں Divine Energy شکتی کے ساتھ متکلم ہے!!! ایسے غیر مرئی مصدر تک رسائی کے باوصف اس مرکزی کردار سمیت تمام کرداروں کو آخر تک زمین کے ساتھ جوڑے رکھنا؛ ارضی قضایا کو ماورائیت کے حوالے نہ کرنا؛ اصل تحسین کو اس نقطے پر مرکوز رہنا چاہیے! حتا کہ میری جب فہد کے ہاتھ پر مذہب کی تبدیلی کے تجربے سے بھی گزرتی ہے تو

زمینی حقائق اپنے مسائل کو اوجھل نہیں
کرتے؛ اس Metamorphosis کا
صلہ بھی کسی داستانوی انہونی کو سامنے نہیں
لاتا جو وہ محبت کرنے والوں کے دائمی وصال
کو انعام بنا ڈالے! وگرنہ زیست کو پیش
کرتے ہوئے ہر لاینحل عقدے کے لیے
ابہام کے مروج و مجرب رنگوں سے گڈھب
منظر نامے کو دھندلا دینا، ہمارے کلاکار کے
بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

راقم السطور نے محمود ظفر اقبال ہاشمی کے
ناول 'سفید گلاب' کو ایک چوکس قاری کے
طور پر پڑھنے کی شعوری کوشش کی ہے اور
اپنی نگاہ حیلہ جو کو ان مقامات کی کھوج میں
مصروف رکھا ہے کہ کہیں سے وہ Slots
دستیاب ہو جائیں جنھیں پراسراریت سے
پر کرنے کا ہنر آزمایا گیا ہو لیکن ایسا ہو نہیں
سکا؛ اسی لیے اس ناول کی تفصیلات کو
'جزئیات نگاری کے جادو' سے موسوم کر کے
بسہولت آگے نہیں بڑھا جا سکتا بلکہ رک کر یہ
اعتراف کرنا پڑے گا کہ فرد کی کسی بھی نوع
کی باطنی واردہ ہو یا بیرونی منظر سے جڑا کوئی
نقش ہو؛ ان پہلوؤں سے بیان میں تشنگی کی
نشاندہی کافی دشوار ثابت ہوگی کیونکہ ناول کا
مرکز ثقل مراقبہ نہیں بلکہ دیدہ بینا کی مرہون
منت دیکھی بھالی دنیا ہے اور چل پھر کر حقیقی
/ واقعی محاضرات کو محاصرے میں لینا بلاشبہ
اعصاب شکن مشقت ہے اور 'سفید گلاب'
کے خالق نے اس صعوبت کو خوشی خوشی جھیلا
ہے، لیکن رسول حمزاتوف کے قائم کیے
ہوئے کڑے معیار کو گزند نہیں پہنچنے دیا گیا
یعنی نظریے کی فراوانی نے خیال کی فراوانی
کو ذکار نہیں کیا؛ یوں ناول کی 'ناولٹی' سے متن
کہیں بیگانہ نہیں ہوا!!

محمود ظفر اقبال ہاشمی کے ناول: 'سفید گلاب'
میں سفرنامے کا فلیور الگ سے کیف پیدا کرتا
ہے لیکن بعنوان سیاحت تفریحی مواد سے
قاری کو بہلانے کا شغل اختیار نہیں کیا گیا،
تجزیے کا عمق قدم قدم پر ذہین قاری کا
خیر مقدم کرتا ہے۔ خاص طور پر دیہی
معاشرت اور جمال فطرت کے دلفریب
انگ اور رنگ اس قدر اوریجنل ہیں کہ کوئی
شیڈ بھی محض تخیل سے کمک پا کر قلمبند نہیں کیا
گیا؛ اسی لیے ان شاداب اوراق میں سرسبز
ماحول کی خوشبوئیں تک محصور کر دی گئی ہیں۔
کھیتوں میں طلوع صبح کی تفاصیل شاہد قاری
کو تصدیق کے بلند مقام پر فائز کر کے یوں
سرفراز کر دیتی ہیں جیسے وہ کسی زریں
ساعت میں خالق کے عمل تخلیق اور پیغمبر کی
زبان سے جاری ہونے والے کلام کا
مصدق ہو گیا ہو!!

'سفید گلاب' بادی النظر میں مشرق و مغرب
کے بیچ حائل مغایرت کو علمی بنیادوں پر گفتگو

کا موضوع بناتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے نظری مباحث بالائی سطح پر بہت کم تیرتے ہوئے ملتے ہیں؛ عام طور پر کرداروں کے بطون سے اس مضمون کی ایسی اکناف برآمد ہوتی ہیں جو ذہنی افق کو پھیلانے کے ساتھ ساتھ رم جھم کو قاری کی تقدیر بنا دیتی ہیں۔ جی ہاں! گریہ کا پیہم عمل اس ناول کا جزو لاینفک ہے۔ پڑھنے والا تادیر سوچتا ہی رہتا ہے، کیا ان Ruptures کو سدا اسی طرح رہنا ہے؟ کیا ان طنابوں کے بیچ فاصلہ یوں ہی جھولتا رہے گا؟ اب یہاں بھی نعرے کی گونج نے سر نہیں اٹھایا نہ 'گلوبلائزیشن' کی دانشوری کو زحمت دی گئی ہے۔ میری سے مریم تک کا سفر ان گنت مراحل سے گزرا ہے۔ اس روداد میں تبسم بہت کم نصیب ہوا ہے، لیکن اس صراحت کے ساتھ عرض کرنا ہے کہ رقت کا تجربہ قاری کے جذبات میں نہیں شعور میں تحلیل کیا گیا ہے۔

بظاہر عورت مرد کی روایتی محبت کا تجربہ کہانی کی متداول لکیر کو تعیین آشنا کرتا رہتا ہے لیکن پہلو بہ پہلو ایک نوع کا ارتفاع بنت میں برابر فعال ہونے کی گواہی بھی دیتا ہے؛ یوں کردار کی ذات سے جڑا وہ تحول جس نے مشرق و مغرب کو نیا سنگم عطا کیا ہے؛ اس میں مناظرہ نہیں بلکہ ایسی کایا کلپ ہے جس نے انضمام کو نئے معانی دیے ہیں۔

سمٹاؤ کے مرحلے میں مشرق جیت سے ہمکنار نہیں ہوا، مغرب کے حصے میں ہزیمت نہیں آئی بلکہ مستقل قدر کے نور نے فتحمندی کی سرشاری قاری کی روح میں نفخ کر دی ہے اور یہی وہ مطلقیت کی توانائی تھی جسے راوی نے پورے اعتماد کے ساتھ ماجرا بنانے کا کرشمہ دکھایا ہے! البتہ اس پس منظر میں یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ Relativity کو Absolutness کے پیمانے پر پرکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ تو یہاں صدفی صد قائم بالذات معروضی معیار پر انحصار تکنیکی غلطی ہوگی! راوی جسے صدق دلی سے مطلق یقین کرنا چاہے، وہ کر سکتا ہے، اس سے یہ حق چھینا نہیں جا سکتا! ناول میں یہی وہ بنیادی کیل ہے جس پر کہانی کا چاک گھمایا گیا ہے اور اس نپی تلی گردش نے جہاں مریم اور نور بانو جیسے لافانی کردار قاری کے حافظے کا حصہ بنا دیے ہیں وہاں اسے ایک عجیب Momentum میں بھی شریک کیا ہے کہ وہ کتھا کے تسلسل کے سامنے خود کو سرنڈر کر دیتا ہے وگرنہ آخر میں جس سریع الرفتاری کے ساتھ زماں کے زینے پر واقعات نے صدور کیا ہے وہ معمول سے کافی ہٹ کر معاملہ ہے!!!

☆☆☆☆☆

خواب گر ۔۔۔۔۔ سفر آہستہ آہستہ

انسان اور سماج لازم و ملزوم ہیں۔ انسان میل جول کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آدم سے لے کر آج کے جدید آدمی تک سبھی مل جل کر رہنا پسند کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے ہیں ۔ بوقت ضرورت اک دوجے کا سہارا بنتے ہیں۔ اپنے سماجی ماحول اور معاشی ضروریات کے مطابق اپنا آرام، سکون اور گھر بار تک قربان کر کے کسی کی راحت کا سامان کرتے ہیں۔ آج بھی ہمارے دیہی علاقوں کے غریب نوجوان اپنی معاشی مشکلات حل کرنے کے لئے بڑے شہروں کا رخ کرتے ہیں۔ صنعتی شہروں میں جا کر، اضافی وقت لگا کر محنت مزدوری کرتے ہیں۔ اسی طرح پہاڑی علاقوں کے نوجوان جنھیں بظاہر قدرت نے ہر طرح کے حسن و جمال سے مالا مال کیا ہوا ہے وہ بھی اپنے دل میں ارمان اور آنکھوں میں خواب لیے میدانی علاقوں کی طرف آتے ہیں تا کہ انھیں بھی وہ آسائشات میسر آسکیں جو شہر والوں کے لئے بنیادی ضروریات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ "خواب گر" ایسے لوگوں کی کہانی ہے جنھیں اپنے خواب پورے کرنے کے لئے ایک زندگی کی نہیں تین نسلوں کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ کہانی دوسری عالمی جنگ سے تقسیم ہند تک کے زمانے کا احاطہ کرتی ہے۔ "خواب گر" کا ابراہیم ایک ایسا نوجوان ہے جو اپنا گھر بنانے اور اپنے گھر والوں کا مستقبل سنوارنے کی خواہش دل میں لیے تھلے لا کی بلندیوں سے شہر کے بڑے ہوٹل میں بیرا گیری کر کے بڑا خوش اور مطمئن ہوتا ہے۔ پہلی بار جب اس نے اپنا گھر چھوڑا تو اس کی عمر تیرہ برس تھی۔ وہ اپنے علاقے کے دیگر افراد کی طرح خاموشی سے مسلسل محنت کرتا رہا۔ جب وہ بالغ اور عاقل ہوا تو اس نے پہاڑی اور میدانی زندگی کا موازنہ شروع کر دیا۔ اسے ان کے درمیان زمین آسمان کا فرق محسوس ہوا۔ دونوں کا معیار زندگی یکسر مختلف تھا۔ اگر چہ اس نے رسمی تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی لیکن عملی اور محنتی زندگی نے اسے بہت کچھ تعلیم کر دیا تھا۔ وہ سماجی اور طبقاتی تقسیم کو

مظفر اقبال

سمجھنے لگا تھا۔ معاشی ناانصافی اور عدم مساوات پر اس کا دل کڑھتا تھا۔ اپنا اور اپنے جیسوں کا دکھ ابراہیم سادگی سے روتا ہے۔

"تھوڑی اجرتوں پر بھاری خدمات حاصل کرنے والے اور ان سے اپنی زندگی کی آسائشیں پوری کرنے والے یہی سوچتے ہیں کہ انھوں نے ہمیں بڑے آرام سے رکھا ہوا ہے، ہم پر بڑا احسان کیا ہوا ہے"۔

معاشی استحصال کے ساتھ ساتھ یہ لوگ اپنی زبان، پہچان اور شناخت کے المیے سے بھی دوچار ہوتے ہیں۔ کوئی ان کا نام، نسب قوم قبیلہ جاننے کا تردد نہیں کرتا۔ ان کے ہم وطن میدانی علاقوں کے باشندے سیر و سیاحت کے لئے گلگت بلتستان اور دیگر پہاڑی علاقوں تک پہنچ کر بھی ان تک نہیں پہنچے۔ ابراہیم کے بقول چند انگریز سیاحوں، مشنریوں اور سیکرٹ سروس افسروں کے علاوہ انھیں کسی نے نہیں پہچانا۔ اس کا سبب بھی انگریزوں کی محبت یا انسان دوستی نہیں بلکہ لداخ کا علاقہ ہے جو دفاعی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ پھر اس کے ایک طرف شمالی علاقہ جات کا پہاڑی سلسلہ ہے۔ ایک جانب چین کا بارڈر ہے، وسط میں کشمیر اور پھر ہندوستان کی سرحد ہے۔ ان جفاکش بلتیوں اور ان جیسے دیگر محنت مزدوری کرنے والے غریبوں کی دیانت اور وفاداری کو سراہنے والے بھی محض جذباتی بلیک میلنگ کر کے اپنا کام کم سے کم پیسوں میں نکلوانا چاہتے ہیں۔ ابراہیم کو اس صورت حال کا کسی قدر ادراک ہے لیکن اس کے علاقے کی اکثریت ایسا سوچنے سے بھی قاصر ہے اور بڑی خاموشی کے ساتھ نسل در نسل صاحبوں کے لئے باربرداری کا کام بڑی لگن سے سرانجام دے رہی ہے۔ ان صاحبان کو پھر کیا پڑی کہ وہ ان کی روایات اور رسومات کے بارے میں پوچھ کر اپنا وقت ضائع کریں۔ انھیں کیا ضرورت ہے کہ وہ ان کی نسل اور ان کے چینی اور روسی علاقوں سے تعلق بارے کوئی تحقیق کریں۔ امراء کو تو صرف ان کی خدمت گزاری اور دیانتداری سے غرض ہے۔ اور یہ غریب بھی اچھے دنوں کی آس میں کئی کئی دہائیاں ایک ہی صاحب کی خدمت میں گزار دیتے ہیں اور بقول ابراہیم ان امراء کے درمیان رہ رہ کر بعض اوقات ہم اپنی زبان تک بھول جاتے ہیں۔ قلیل اور شرمناک معاوضوں پر محنت مشقت کرنے والے یہ پردیسی جب مشکل وقت کاٹ کر اپنے وطن جاتے ہیں تو

کوئی نہ کوئی انہونی، کوئی نہ کوئی بری خبر ان کا رستہ دیکھ رہی ہوتی ہے، کبھی کسی اپنے کی دائمی جدائی تو کبھی کسی اپنے کی بے وفائی ان کا استقبال کرتی ہے۔ ان پردیسیوں کو کیسے اور کون بتائے کہ:

واپس نہ جا وہاں کہ ترے شہر میں منیر
جو جس جگہ پہ تھا وہ وہاں پر نہیں رہا

.....

مرنے والوں کی مدت بعد خبر ملنا، برسوں گھر کا منہ نہ دیکھنا، بہتر مستقبل کے لئے اپنا حال خراب کرنا اور اپنے اجتماعی بھلائی کے خوابوں کی تکمیل کی خاطر خود فراموشی کی حد سے گزرنے والے یہ لوگ اپنے گاؤں میں سکول بنانے کا سپنا سچ کرنے کی کوشش میں ہر طرح کی مزدوری اور جگہ جگہ جی حضوری کرتے ہیں، اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے امیروں کی تجوریاں بھر رہے ہیں:

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری ہجرت کیا

.....

ابراہیم اور اس کے خاندان کا خواب ہر دی شعور کا خواب ہے۔ معاشی بدحالی کا جال توڑنے کے لئے وہ جہد مسلسل کرتا ہے جبر مسلسل سہتا ہے۔ خواب بھی نسل در نسل سفر کرتا ہے۔ معاشی بحران کا جال کہیں کہیں سے ٹوٹا ضرور ہے مگر اس میں ایک عمر لگ جاتی ہے۔ اتنے میں انتظار کرنے والوں کی آنکھیں تھک جاتی ہیں۔ ان کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔ محنت کے خوگر یہ پردیسی اندر ہی اندر بچھڑنے والوں سے شکوہ کناں بھی ہوتے ہیں۔

یہ کس مقام پہ سوجھی تجھے بچھڑنے کی
کہ اب تو جا کے کہیں دن سنورنے والے تھے

.....

اچھے دن آجاتے ہیں، خواب سچ ہو جاتے ہیں مگر پورے خاندان کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ اسماعیل اور ابراہیم کا خواب علی مردان تک پہنچتا ہے اور خلیل کے ہاتھوں اسے تعبیر ملتی ہے۔ مجموعی طور پر ناول مثبت فکر کا ترجمان ہے۔ الطاف فاطمہ ناصر کاظمی کی طرح ہجرت کا تذکرہ کیے بنا نہیں رہ سکتیں۔ یہ ان کا خاص موضوع ہے۔ وطن اور ہم وطنوں سے ان کی محبت مثالی ہے کرداروں کے نام اور کہانی کا فکری تانا بانا بہت سادہ اور دلچسپ ہے۔ اسماعیل اور ابراہیم کے خواب کی خلیل کے ہاتھوں تکمیل ایک الگ روحانی سرشاری لیے ہوئے ہے۔

☆☆☆☆☆

غزل

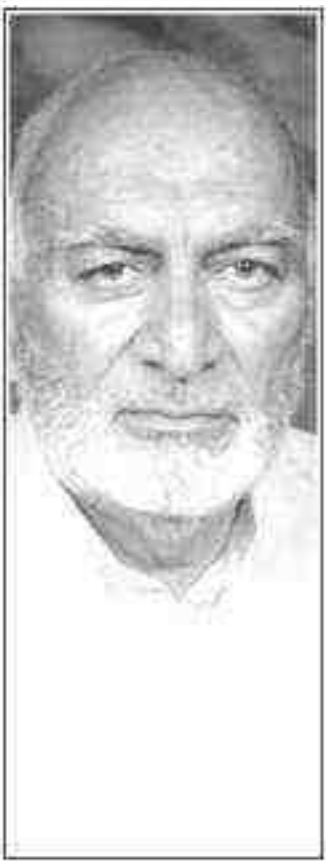

مرا بدن ہی کبھی راکھ سے نہیں نکلا
اے خاک من میں ترے چاک سے نہیں نکلا

میں کیسے رنگ بھروں گا سیاہ تختے میں
جو سُرخ پھول مرے چاک سے نہیں نکلا

میں منتظر ہی رہا پیارے پیارے فقروں کا
تمھارا خط جو مری ڈاک سے نہیں نکلا

مجھے کہاں سے ملی شاعری کی رنگینی
سرور جام کسی تاک سے نہیں نکلا

چھپا کے رکھا ہے مہتاب اُس نے داماں میں
جو اس کا سایہ بھی پوشاک سے نہیں نکلا

تجھی سے آس رہی حرفِ خیر کی ثاقبؔ
دعا کا شعر بھی ادراک سے نہیں نکلا

آصف ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نام یوسفؑ رکھ دیا، یعقوبؑ کے اندوہ کا
خانہ ویراں، وجہِ اندوہِ غزالاں کیا ہوا؟

غزل

جوشِ تخلیق ہے ہنر کیا ہے!
جس میں سودا نہ ہو وہ سر کیا ہے

جس پہ گزرے نہ بے گھری کی شام
اس کو کیا قدر ہے کہ گھر کیا ہے!

اٹھ گئے کیا تمام دل والے!
ایک وحشت سی در بدر کیا ہے

یہ نہ دیکھو کہ معتبر ہے کون
اس کو سمجھو کہ معتبر، کیا ہے!

نسل آدم کی، خُو درندوں کی
کوئی جنگل ہے یا نگر، کیا ہے؟

سچ بھی ہتھیار ڈال دیتا ہے
جھوٹی تعریف میں اثر، کیا ہے!

زندگی کی لگن ہے کیوں اتنی!
جان جانے کا اتنا ڈر کیا ہے!

وسعتِ خالق کا نقش ہے مخلوق
کوزہ بولے گا، کوزہ گر کیا ہے

شوق دے گا نشان منزل کا
گرد بتلائے گی سفر کیا ہے!

امجد اسلام امجد

غزل

کہانی بے سر و پا روز اک تحریر تے ہو
ہم ایسے تو نہیں جیسا ہمیں تشہیر تے ہو

دکھاتے ہو ہمیں سب عکس من مرضی مطابق
حقیقت اور ہے، تم اور کچھ تصویر تے ہو

کوئی معیار نیک و بد نہیں کھلتا تمہارا
کسے تحقیر تے ہو اور کسے توقیر تے ہو

فلک سے تم پہ یہ کیسا عذاب اترا ہوا ہے
اُسے مسمار تے ہو خود جسے تعمیر تے ہو

تمہارے ساتھ کوئی گفتگو ہو بھی تو کیسے
ذرا سی بات پر تم دیر تک تقریر تے ہو

اسی کو مصرف ایماں سمجھ رکھا ہے تم نے
کہ کوئی اختلافے تو اُسے تکفیر تے ہو

میاں یہ دل ہے ایسے صید ہو سکتا نہیں ہے
عبث دنیا کے رنگوں میں اسے زنجیر تے ہو

کہو کہتے ہوئے کیا کیا گزر جاتی ہے دل پر
کہ جس سے سننے والوں کے کلیجے چیر تے ہو

سخن کو سوچتے ہو کیسے کیسے انگ عالیؔ
کہیں اقبالتے ہو اور کہیں پر میر تے ہو

جلیل عالی

غزل

جلیل عالی

جھکے کیا کیا مگر کچھ التفات اُس کا نہ پایا
کوئی قربت کجا دیوار کا سایا نہ پایا

یہ کن باغوں کے پنچھی کیسے صحراؤں میں لائے
ندی چھوڑ آئے جس کی زد میں وہ دریا نہ پایا

ترے سب چاہنے والوں کے رُخ زرد آ گئے ہیں
دلوں میں جو تری تصویر تھی ویسا نہ پایا

اداکاری محبت کی کہیں تجھ سی نہ دیکھی
جفاکاری میں بھی کوئی ترے جیسا نہ پایا

تری دُھن میں بھٹکتے زندگی گزری ہماری
ملا تو بھی نہیں اور گھر کا بھی رستا نہ پایا

تو پھر یہ عشق تو ہرگز نہیں کچھ اور شے ہے
اگر اندر کوئی رقصِ دِگر ہوتا نہ پایا

ملا اِس بار وہ جس والہانہ پن سے عالیؔ
اُسے ہم نے کبھی اس رنگ میں سوچا نہ پایا

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

ہر قدم خاک بہ سر، حشر بہ پا رہتے ہیں
ہم کہ چپ رہ کے بھی سرگرمِ نوا رہتے ہیں

غزل

اندھیرا ہے تو اندازے سے آئے
مگر جو آئے دروازے سے آئے

میں شاید اُس گلی میں آگیا ہوں
مرے کانوں میں آوازے سے آئے

بھگتنا تھا نتیجہ عاجزی کا
گزر کر ہم بھی خمیازے سے آئے

اب آگے اس کی خوشبو لے چلے گی
یہاں تک اپنے اندازے سے آئے

یہاں تو مسکرانے کا ہنر بھی
بکھرتے غم کے شیرازے سے آئے

میں دھو ڈالوں گا چہرہ زندگی کا
تری خوشبو اگر غازے سے آئے

مکمل روشنی ملتی نہیں ہے
ہمارے ہاتھ ایجازے سے آئے

شکاری اپنے اندازے سے نکلے
پرندے اپنے اندازے سے آئے

عجب ہے اپنے گھر میں بھی کنور ہم
گزر کر چور دروازے سے آئے

اعجاز کنور راجہ

غزل

حسن عسکری کاظمی

وہ دل زدہ ہوں کہ فرصت اداس رکھتی ہے
نہ ہو تو اس کی ضرورت اداس رکھتی ہے

کبھی تو ہجر کا موسم اداس رکھتا تھا
ہجومِ یاس میں قربت اداس رکھتی ہے

کہاں وہ چہرہ وہ آنکھیں وہ قامتِ زیبا
زوالِ حسن کی صورت اداس رکھتی ہے

قریب ہوں تو شکایت ہے دوستوں سے مجھے
جو دور ہوں تو محبت اداس رکھتی ہے

بہت ہی صاف ہے آئینۂ نظر لیکن
مجھے تو دل کی کدورت اداس رکھتی ہے

نشاطِ وصل کا لمحہ خیال و خواب ہوا
اب اختیار کی زحمت اداس رکھتی ہے

امیرِ شہر کو دھڑکا لگا ہے جان کا حسنؔ
غریبِ شہر کو غربت اداس رکھتی ہے

غزل

یہ جو کم بخت زندگی ہے نا
لمحے لمحے کی خودکشی ہے نا؟

اس میں بس اک بری کمی ہے نا
یوں تو دنیا بھری پڑی ہے نا!

تیرگی ختم ہو گئی ہے نا؟
میرے ہونے سے روشنی ہے نا

سرد مہری دکھا رہی ہو بہت!
اصل میں خود سپردگی ہے نا

کچھ شکایت نہیں ہے سورج سے
اک کرن تو دکھائی دی ہے نا

فیصلہ جلد ہونا چاہیے تھا
فیصلہ اب بھی ملتوی ہے نا

میں ذرا دوسری طرف دیکھوں
یہ رعایت تو تم نے دی ہے نا؟

جمع کر لوں میں اور بھی کچھ غم
وقت تھوڑا سا تو ابھی ہے نا؟

دشمنوں سے بھلا ڈروں کیونکر
دوستی بھی تو دشمنی ہے نا!

پیاس میری ابھی بجھی ہے کہاں!
تیری گاگر ابھی بھری ہے نا

منتظر اس کا ہوں نسیم سحر
رک گئی ہے مری گھڑی ہے نا!

نسیم سحر

غزل

مجھ سے کیوں آج تک بسر نہ ہوئی
شب جو آسودہ سحر نہ ہوئی

کیسی تقدیر کا سفر گزرا
کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی

جس کو تقریر لکھ کے دی میں نے
اس کی آواز معتبر نہ ہوئی

لاشعوری تھی خواب کے مانند
شاعری مظہرِ ہنر نہ ہوئی!

یوں وہ گزرا ہے روشنی کی طرح
میرے سائے کو بھی خبر نہ ہوئی

رقصِ عرفاںؔ میں وقت کی رفتار
تیری خوشبو کی ہم سفر نہ ہوئی

غالب عرفان

غزل

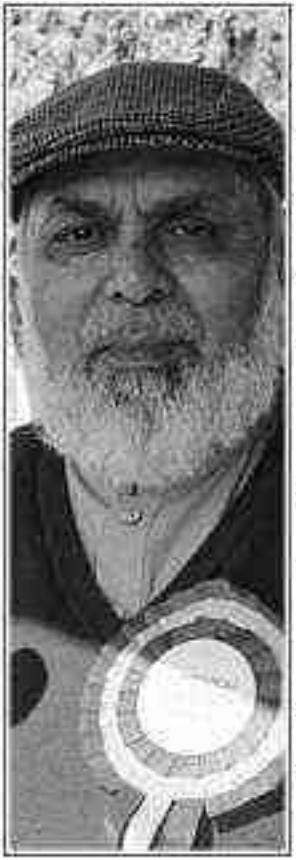

مجھے خود کو بدلنا کتنا مشکل ہو گیا ہے
تمھارے ساتھ چلنا کتنا مشکل ہو گیا ہے

تمھاری دوستی آزار بن کر رہ گئی ہے
یہ قصّہ اب نبٹنا کتنا مشکل ہو گیا ہے

تری کس بات کو لیں، کون سے وعدے پہ جائیں
ترے پیکر میں ڈھلنا کتنا مشکل ہو گیا ہے

کسی بھی سانحے پر آنکھ اب روتی نہیں ہے
دلوں کا اب پگھلنا کتنا مشکل ہو گیا ہے

انیسِ جاں! مقابل مافیا ہے اور میں ہوں
یہاں آگے نکلنا کتنا مشکل ہو گیا ہے

محمد انیس انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک بے خبری مایۂ ارباب خبر تھی
یہ بات کھلی ، حیرت ارباب نظر سے

غزل

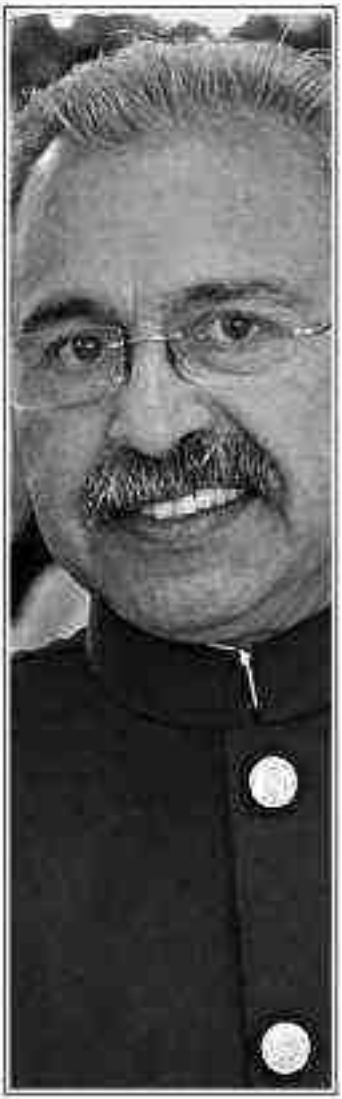

سمجھ میں آیا مجھے گر کے اپنے سائے پہ
زیادہ اڑتے نہیں مانگ کر پرائے پہ

تھا آسماں کا ارادہ مگر زمانے کو
ملے زمیں پہ مرے خون میں نہائے پہ

ہنسی اڑاتے نظر آتے ہیں کھنڈر ان کی
جنہیں گمانِ محلات تھا سرائے پہ

یقین کر انہیں ٹھوکر کبھی نہیں لگتی
نگاہ رکھتے ہیں جو روشنی کے سائے پہ

بجھی نہ پھر بھی ہواؤں سے اس چراغ کی لو
سبھی پتنگوں نے جس کے لیے جلائے پر

ہمیں ضرور بتانا تمہیں اگر مل جائیں
کہیں محبتیں قسطوں پہ دل کرائے پہ

وہاں پہ اصل پروں کا ہے کیا ہوئے نہ ہوئے
جہاں پہ ملتے ہوں راحت بنے بنائے پر

راحت سرحدی

غزلیں

جو بھی کچھ ہے مرے حجرے میں میسر لے جا
دل نہیں بھرتا تو پھر آج مجھے گھر لے جا

قیدِ ہستی سے تو گھبرانے لگا جی میرا
صحبتِ یار کبھی آ مجھے باہر لے جا

اے ہوا، ہمدمِ دیرینہ سے ملنا ہے مجھے
کسی دن مجھ کو بھی اُس پار اُڑا کر لے جا

فیصلہ جو بھی ہُوا بعد میں ہم دیکھیں گے
اے اجل! پہلے سرِ چشمۂ کوثر لے جا

روز لے آتا ہے خاورؔ یہ پلندے کیا کیا
کام اک آدھ کبھی گھر کا بھی دفتر لے جا

خاور اعجاز

کثرتِ غم کے مقابل میں جگہ کتنی ہے
کوئی اندازہ کہ اب دل میں جگہ کتنی ہے

تُو بھی آ بیٹھ مرے پہلو میں اے جانِ نحیف
دیکھ تو کوچۂ قاتل میں جگہ کتنی ہے!

آن بیٹھیں گے کبھی ہم بھی کسی کونے میں
دیکھ لیں گے تری محفل میں جگہ کتنی ہے

آنکھ ہی کافی نہیں اُس کی تمنا کے لیے
غور کرنا ہے کہ اِس دل میں جگہ کتنی ہے

جو بھی آ جائے سما جاتا ہے، معلوم نہیں
ابھی دلدار کے محمل میں جگہ کتنی ہے

غزل

کون ستم گر شہر میں ثاقبؔ درد کہانی لکھتا ہے
بے حس ہے جو لوگوں کی آنکھوں میں پانی لکھتا ہے

چپکے چپکے آنے والا کون ہے میرے کمرے میں
جاتے جاتے جو بے نام سی ایک نشانی لکھتا ہے

خواب نگر کا درباں ہے یا میری سوچوں کا پرتو
میرے پہلو میں جو ہر شب میری رانی لکھتا ہے

پڑھنے والے پڑھ سکتے ہیں نقش بدلتے چہرے کے
وقتِ شام گزرتا دن تو اپنی کہانی لکھتا ہے

چلتے چلتے گلیوں میں اک پاگل سا اک کاغذ پہ
چہرہ گل گوں زلفیں مشکیں آنچل دھانی لکھتا ہے

گھر سے نکل کر باہر دیکھو کیسے رنگ ہیں قدرت کے
چلتے چلتے دیواروں پہ اک سیلانی لکھتا ہے

زیست میں کیسے موڑ آئے ہیں کیسے لہریں الجھی ہیں
خشک بھی ہو جائے تو دریا اپنی روانی لکھتا ہے

گھر کے مکیں گر سچے نہیں اور بات اپنی کے پکے نہیں
گھر کے ماتھے پر پھر کوئی اک ویرانی لکھتا ہے

منظور ثاقب

غزلیں

ہمکناری کی نعمتیں پائیں
موسمِ گُل میں خلوتیں پائیں

دل نے کیا کیا عنایتیں پائیں
خوش جمالوں کی صحبتیں پائیں

اک سخی کی سخاوتیں پائیں
مشکلوں میں سہولتیں پائیں

ایک غنچہ دہن کی مرضی سے
بسترِ گُل کی راحتیں پائیں

اُس کا لطف و کرم فزوں تھا آج
آج پُرکیف لذتیں پائیں

تیرے کوچے سے شادکام آئے
اپنے گھر سے ملامتیں پائیں

جب کوئی مہرباں ہُوا راشد
دم بہ دم ہم نے رفعتیں پائیں

ممتاز راشد لاہوری

وضع داری کا بوجھ ہے بھاری
انکساری میں اب ہے بیزاری
بھر رہی ہے نظر میں گلکاری
ایک ناری کی بھیگتی ساری
اُس کے نینوں کا وار ہے کاری
جیسے تلوار کوئی دو دھاری
اک غضب کا ہے اُس کا روپ سروپ
اک غضب کی ہے اُس کی فنکاری
آپ خود بھی نہ جانتے ہوں گے
آپ سے جو ملی ہے سرشاری

آخری سانس تک نہ جائے گی
یہ ہماری وفا کی بیماری
دشمنی بھی ہے جس کی ہوشربا
راشد اپنی اُسی سے ہے یاری

غزل

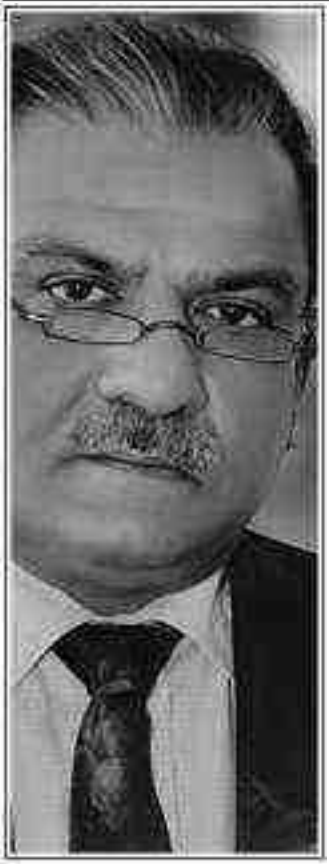

نقش و نگارِ زیست جو درکار ہو گئے
ہم لوگ آئنوں کے طرف دار ہو گئے

لو آج سر کو دشنہ و خنجر پہ رکھ دیا
لو آج ہم بھی صاحبِ دستار ہو گئے

جب بھی عدو کے ہاتھ بڑھے گلستاں کی سمت
اپنے تمام لفظ ہی تلوار ہو گئے

سینچا ہر ایک پھول کو اپنے لہو کے ساتھ
شاخِ چمن کے واسطے مہکار ہو گئے

طوفانِ ظلم و جبر اگر یاد آ گیا
ہم تھے جو اس کے سامنے دیوار ہو گئے

شیدا یہ زندگی کا تقاضا تھا اس لیے
ہم ہر نفس پہ صاحبِ کردار ہو گئے

جاوید شیدا

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

دستکیں دیں، دلِ آوارہ نے در در خالد
حیرتی نے یہ بیاباں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

غزل

یہ کیسا آ گیا ہے دیکھیے تو دور اکرم
اگر فرصت ملے تو کرنا اس پہ غور اکرم

نہ ہر اک یار ہو سکتا ہے یارِ غار جیسا
نہ ہر اک غار ہو سکتا ہے غارِ ثور اکرم

ابھی پہلی پہیلی کا ہی حل نکلا نہیں تھا
کہ اس نے ڈال دی ہے اک پہیلی اور اکرم

علاج اس کا اسی کے پاس ہے سب جانتے ہیں
اسے بلواؤ اب جیسے بھی ہو فی الفور اکرم

کسی بھی طور جاؤں گا میں کوہِ طور پر اب
منا کر لاؤں گا اس کو کسی بھی طور اکرم

رہے گی اور کتنے دن بھلا یہ بادشاہی
چلے گا اور کتنے دن یہ ظلم و جور اکرم

اکرم ناصر

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

اے قطرۂ خون مصحفِ رخسار پہ مل بن
اے سطرِ تپاں! کاغذ سادہ پہ دہک بھی

غزل

عجب اک منظرِ اُفتادگی ہے سامنے
فروغِ بے حسی اور بے بسی ہے سامنے

اَنا تو پرشکستہ سرنگوں بے حال ہے
خودی بھی سربریدہ پھر رہی ہے سامنے

تلاشِ منزلِ تاباں میں مخلص ہیں سبھی
مگر حدِ نظر تک تیرگی ہے سامنے

بُجھاتا ہے دلوں کو گمرہی کا راستا
فروزاں گو چراغِ آگہی ہے سامنے

پسِ پردہ رہیں وہ دشمنی میں مستعد
وہ جن کا ہر اصول دوستی ہے سامنے

سکھائے دینِ فطرت سے فراری کے ہنر
فنونِ غرب کی جو ساحری ہے سامنے

لگا دے لے مرے! مالک کنارے پر اسے
یہ ملت کی جو ناؤ کاغذی ہے سامنے

جمالِ زندگی جس کو سمجھ بیٹھے ہیں سب
حقیقت میں زوالِ زندگی ہے سامنے

خلوص و عجز کا جو ہے جہاں میں قدرداں
یقیناً دہر میں وہ جوہری ہے سامنے

قضا کو دیکھ کر لبیک کہہ دیتے ہیں وہ
سمجھ لیتے ہیں جو منزل یہی ہے سامنے

نہیں حالات بس میں اب کسی کے آفریں
مری چارہ گری اور شاعری ہے سامنے

رشید آفرین

غزل

قصرِ جمالیات کا گہنا زمین ہے
اور آسماں کی حاشیہ آراء زمین ہے

دستِ کرشمہ ساز کی جو ہاتھ میں ہے گیند
خشکی تری کا گویا کہ گولا زمین ہے

عرشِ بریں کہ تخت سا بہتا تھا آب پر
پھر اوج سے فراز نے بولا زمین ہے

نقش و نگار کھینچ کے لوحِ دوام پر
خاکہ سا کیسا خاک بنایا زمین ہے

مٹی جو اپنی خاک اڑانے لگی تو پھر
گرد و غبارِ طور نے جانا زمین ہے

بُرجوں کا کھیل جاری و ساری ہے اک طرف
رد و بدل میں گھومتا چرخا زمین ہے

اس نے کہا تو حیرتیں تجسیم ہو گئیں
حیرت کدے میں بیضوی قطعہ زمین ہے

جلوہ نمائے شوق ہے یہ کائناتِ عشق
اس ظرفِ بے پناہ کا پیندا زمین ہے

اصغؔر تمام موسموں نے سوچ کر کہا
اپنے تغیرات کا چہرہ زمین ہے

علی اصغر عباس

غزل

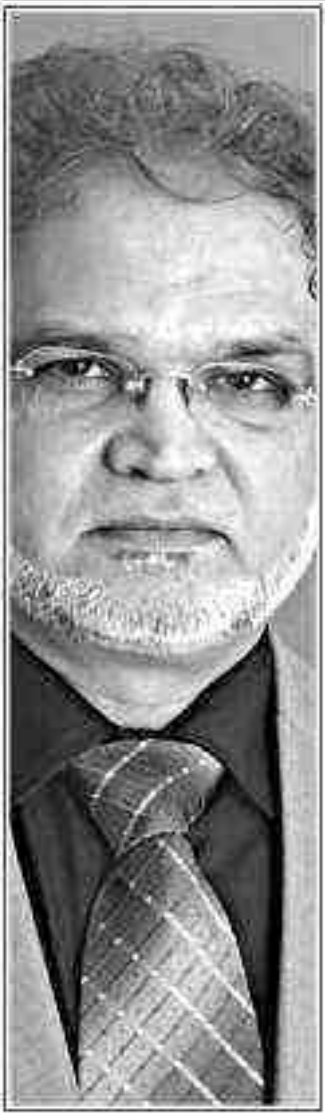

لہو ترنگ جو وحشت سراپا ہوتا ہے
وہی اکیلے میں الفت سراپا ہوتا ہے

کسی نے تخلیہ پاکر جو ہم نشینی کی
کھلا کہ ہجر بھی وصلت سراپا ہوتا ہے

چھپا کے بیٹھا ہے دستک جو اپنی آنکھوں میں
درِ جمال پہ نوبت سراپا ہوتا ہے

رموزِ کیف ہیں مخفی سرورِ بوسہ میں
تبسمِ لباں حدت سراپا ہوتا ہے

نہالِ حسن پہ ٹھہرا بہار کا موسم
ہر ایک رُت میں ہی زینت سراپا ہوتا ہے

لگاتی گھاؤ محبت ہے، پھر بھی دیتی ہے
مگر یہ عشق مصیبت سراپا ہوتا ہے

ہمارے پیار نے دشمن سے انتقام لیا
جو آئے سامنے حیرت سراپا ہوتا ہے

ستارہ ساز کی نظروں کا یہ کمال ہوا
کہ کور چشم بصیرت سراپا ہوتا ہے

ترے ہی دھیان کی لو سے چراغِ دل اصغر
جلے تو طور کی نسبت سراپا ہوتا ہے

علی اصغر عباس

غزلیں

عہد رفتہ کا ماتم نئے سال میں
ہیں پرانے وہی غم نئے سال میں

بھاگتے جا رہے ہیں ستارے ادھر
جا کے لیں گے کہیں دم نئے سال میں

وقت سے وقت مل جائے گا ، دیکھنا
اور بچھڑ جائیں گے ہم نئے سال میں

لو پکڑ لو یہ انگلی مرے خواب کی
آؤ چلتے ہیں باہم نئے سال میں

میرے حامدؔ، ہو کیوں اتنے بے تاب تم
کیا ملیں گے نئے غم نئے سال میں!

حامد یزدانی

بہارِ جاں فزا کے بعد کیا ہے
ابھی سے کیوں پرندہ سوچتا ہے!

ازل کے دن سے ہی سینے میں ہے دل
ازل کے دن سے ہی محشر بپا ہے

اگر ملنا تمہارا وہم سا تھا
بچھڑنا بھی تمہارا خواب سا ہے

بدلتے جا رہے ہیں عکس کیونکر
وہی میں ہوں، وہی یہ آئنہ ہے

یقیں مانو، کہیں جل تھل نہ ہو گا
یہ بادل بارہا برسا ہُوا ہے

مرے چاروں طرف پھیلا یہ دریا
مرے ہی رُخ اچھلتا آ رہا ہے

ستارہ ہے وہ کوئی اور حامدؔ
جہاں شب کا نظارہ جا بسا ہے

غزلیں

ٹوٹ کر برسی ہے اب کے خشک سالی کھیت میں
فصل کی جا بھوک اگ آئی مثالی کھیت میں

ایک دہقاں کو نظام گلستاں سونپا گیا
ہل چلاتا پھر رہا ہے ایک مالی کھیت میں

بیج تو ڈالا نہ تھا پر فصل اگ ہو گئی
کچھ تو آخر رونما ہوتا تھا خالی کھیت میں

یہ زمیں سونا اگل سکتی ہے لیکن شرط ہے
رنگ دکھلائے مری روشن خیالی کھیت میں

فصل کٹنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے مگر
پھر رہے ہیں گاؤں کے سارے سوالی کھیت میں

پھل تو مل ہی جائے گا پرواز لیکن یہ بتا!
ہل چلایا، بیج بویا، کھاد ڈالی کھیت میں؟

یعقوب پرواز

تھکن باندھے ہوئے اپنے پروں میں
پرندے پا شکستہ ہیں گھروں میں

وہ جینے کا تکلف کر رہے ہیں
کوئی سودا نہیں جن کے سروں میں

تعلق خاک سے ہے واجبی سا
مگر شامل ہیں ہم کوزہ گروں میں

یہ اپنی عمر کا عہد زیاں ہے
بھٹکتے پھر رہے ہیں دفتروں میں

ہوا جاتا ہے پھر آباد جنگل
اضافہ ہو رہا ہے جھینگروں میں

وہ دل کا آئینہ صیقل کرے گا
بھرے ہیں رنگ جس نے پتھروں میں

مزاج سنگ رکھتے ہیں جو پرواز
وہی شامل ہیں آئینہ گروں میں

غزل

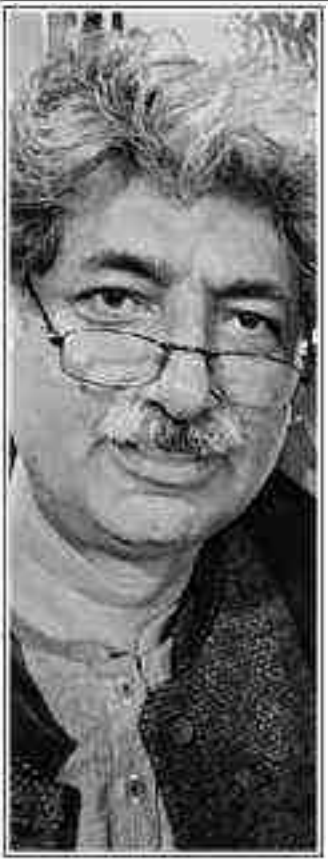

سفید سر کے لیے دھول چاہتی ہے کیا؟
بزرگ شاخِ جواں پھول چاہتی ہے کیا؟

گزارے کس لیے جاتے ہیں پُلِ صراط سے ہم؟
کشادگی زرِ محصول چاہتی ہے کیا؟

یہ بھیڑ کیوں نہیں چھٹتی درِ عداوت سے؟
یہ آج پھر کوئی مقتول چاہتی ہے کیا؟

گلی میں مجھ سے بغلگیر کیوں نہیں ہوتی؟
اداسی بھی جگہ معقول چاہتی ہے کیا؟

معاف کیوں نہیں کرتی رحیم ذات ہمیں؟
یونہی دعاؤں میں مشغول چاہتی ہے کیا؟

ستارہ وار مجھے آنکھ مارتی ہے کبیر
یہ رات مجھ سے کوئی بھول چاہتی ہے کیا؟

کبیر اطہر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جاگ رہا ہے تو مجھ میں
یا ، تیری خو بو مجھ میں

غزل

نکل کے چاند ستاروں کے درمیان سے ہم
نظر زمین سے آتے ہیں آسمان سے ہم

ستارہ اب بھی چمکتا ہے رہنمائی کا
بچھڑ گئے ہیں مگر نقشِ کاروان سے ہم

گزارہ اپنا یہاں مشکلوں سے ہوتا ہے
زمانہ تنگ ہے ہم سے تو دو جہان سے ہم

اب اپنے ہاتھ سے اپنا جہاں بنائیں گے
گزر کے آ گئے قسمت کے امتحان سے ہم

بجھا ہوا کہیں اندر سے ہے ہمارا دل
دوا اُداسی کی کھا کر ہیں شادمان سے ہم

مراد بھی تھی، وفا بھی، وہاں چراغ بھی تھا
اُٹھا کے لائے نہیں عشق کی دکان سے ہم

تھے مشتِ خاک ہم اپنے وجود سے پہلے
تبھی تو اُنسیت رکھتے ہیں خاکدان سے ہم

شبہ طراز

غزل

گر نہیں خوشی غم سے میرے دل کو بھر جانا
یہ بھرم تو رکھ لینا یہ کرم تو کر جانا

وہ جو میری منزل ہے وہ جو میرا حاصل ہے
پوچھتا ہے وہ مجھ سے تم کو ہے کدھر جانا

ظلمتوں کے موسم میں وہ عجیب لمحہ تھا
جگنوؤں کو جب ہم نے دن کا نامہ بر جانا

پانیوں پہ چلنے کو کھیل ہم سمجھتے تھے
ساحلوں کی بانہوں کو ہم نے جب بھنور جانا

جانے کیسا لمحہ تھا عہد طور پرور میں
جب وہاں اندھیروں کو سب نے معتبر جانا

اہلِ کارواں تم کو اب سدا بھٹکنا ہے
ایک بے بصارت کو تم نے راہبر جانا

جگنوؤں کی خو ہم کو خوش بہت جلیل آئی
نور بن کے ظلمت میں دور تک بکھر جانا

احمد جلیل

غزل

آنکھ بینا ہو تو پا لیتی ہے دُورُ الدُّور کو
ظلمتِ شب سے سدا نسبت رہی ہے نُور کو

ڈھونڈتے پھرتے ہیں پُرآشوب دُنیا میں عبث
ناشناسایانِ موسیٰ جلوۂ بے طور کو

کب ملے گی چیرہ دستوں سے زمانے کو نجات
ہر پلکی کاٹ دیتا ہے رگِ دستور کو

الحذر اے تیشی ایّامِ دوراں الحذر
ایک روٹی کے لیے موت آ گئی مزدور کو

منصفی کیا چیز ہے، نامنصفی کیا چیز ہے
حق شناسی کی گواہی ڈس گئی منصور کو

توڑ ڈالو اُس نظامِ بربریت کو جہاں
گرگسوں کے غول نوچیں لاشۂ مجبور کو

حُسنِ گویائی و بینائی ہے میراثِ رسول
کون سمجھائے یہ میرے منبرِ مغرور کو

مُشکِ ناب ارشدؔ کبھی ملتا نہیں بے سُوختن
شُعلۂ آتش دکھاؤ خانۂ زنبور کو

ایم ارشد ارشد

غزلیں

میری نظر میں اب کے عجب التباس ہے
کچھ دور دور لگتا ہے جو دل کے پاس ہے

جو اس نے نوچ ڈالی تھیں میرے سوال پر
سانسوں میں اب تلک انھی کلیوں کی باس ہے

مرغِ چمن کے ساتھ کہیں تم بھی جا بسو
ہم کو خزاں رسیدہ چمن خوب راس ہے

شاید حسیں خیال کی چنگاریاں بجھیں
کہتے ہیں لوگ آپ کا چہرہ اُداس ہے

میں کیسے ہاتھ غیر کا ہاتھوں میں تھام لوں
مجھ کو ترے وصال کی دیرینہ آس ہے

جو اپنے ساتھ لایا بہاروں کی راحتیں
گلشن اسی کے واسطے وقفِ سپاس ہے

وہ جو مسرتوں کی رضا خود نوید تھا
اس کی شفق نگاہ میں اظہارِ یاس ہے

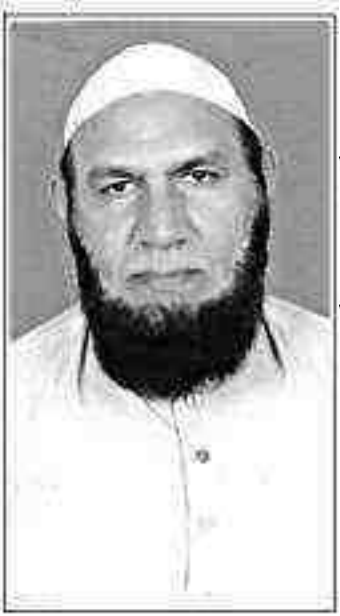

رضا اللہ حیدر

میں اس کو بھول جانے کا ارادہ کر رہا ہوں
کروں گا کس طرح پورا جو وعدہ کر رہا ہوں

پھر اس کے بعد میں نے شیشہ گر کو ڈھونڈنا ہے
ابھی تو کرچیاں دل کی برادہ کر رہا ہوں

میں سنت قیس کی پھر دشت میں زندہ کرونگا
میں محمل کا تعاقب پا پیادہ کر رہا ہوں

کہ شاید اسطرح اس کو محبت کا یقیں ہو
میں دل کو چیر کر اب آدھا آدھا کر رہا ہوں

تلاطم پیار کا پہلے بھی دل میں کم نہیں تھا
میں اس طوفان کو اب کچھ زیادہ کر رہا ہوں

جہانِ رنگ و بو کا مرکز و محور، محبت
میں ہر لحظہ اسی سے استفادہ کر رہا ہوں

مٹانا چاہتا ہوں بے وفا کا نقش دل سے
جلیلی اب دل کا کاغذ پھر سے سادہ کر رہا ہوں

غزلیں

وہ جس سے پیار تھا جب بے مثال ہی نہ رہا
تو بے وفائی کا اس کو ملال ہی نہ رہا

تھے وہ بھی دن کہ تری دید کو ترستا تھا
ہے یہ بھی وقت کہ ملنا محال ہی نہ رہا

کچھ ایسے قرب میں بچھڑے تھے اب کے ہم دونوں
کہ مل سکیں گے کبھی یہ خیال ہی نہ رہا

سمجھ رہا تھا میں جس کو حیات کا حاصل
وہ ایک درد کہ پھر لازوال ہی نہ رہا

شفیق درد کا موسم تو ٹل گیا دل سے
جو کل تھا ذہن پہ غم کا وہ جال ہی نہ رہا

شفیق احمد خان

شہر والوں سے جدا تھے شہر میں بستے ہوئے
کٹ گئی ہے عمر غم کی لہر میں بستے ہوئے

ہر گھڑی دل میں ادھوری خواہشوں کی ہے خلش
کوئی کیسے خوش رہے اس دہر میں بستے ہوئے

رفتہ رفتہ تلخ سے ہم تلخ تر ہوتے گئے
روز و شب اک بے بسی کے زہر میں بستے ہوئے

ہجر میں شام و سحر اک تیرگی ہمراہ تھی
دل کی شمعیں بجھ گئیں اک قہر میں بستے ہوئے

ابر اک بیگانگی کا دل پہ چھایا تھا شفیق
ہم گریزاں خود سے تھے اس شہر میں بستے ہوئے

غزل

ہمارے بیچ رہا ہے جو خون کا رشتہ
بنا لیا ہے اب اس نے جنون کا رشتہ

ہمیں ملا کے رکھے گا یہی سیاق و سباق
سرِ کلام رہا ہے متون کا رشتہ

روا رکھی ہے دسمبر میں سرد مہری بھی
رکھا ہے سرد مزاجی سے جون کا رشتہ

ہمیں تو اشک میسر ہیں ہجر سہنے کو
برونِ چشم رہے مون سون کا رشتہ

نظر پہ خواب کا جادو ہی کام کرتا ہے
سو دل سے جوڑ رکھا ہے فسون کا رشتہ

ہمیں قبول نہیں ہے یہ خارجی دنیا
رکھا ہے جس سے بھی، رکھا درون کا رشتہ

دل و نگاہ کا مرکز ہے بس یہی افروزؔ
نمازِ عشق کا رشتہ، ستون کا رشتہ

افروز رضوی

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

آنکھیں خوشبو کی طرح اُٹھ کے بکھر جاتی تھیں
جانے کس موج میں وہ جانِ صبا اپنا تھا

غزل

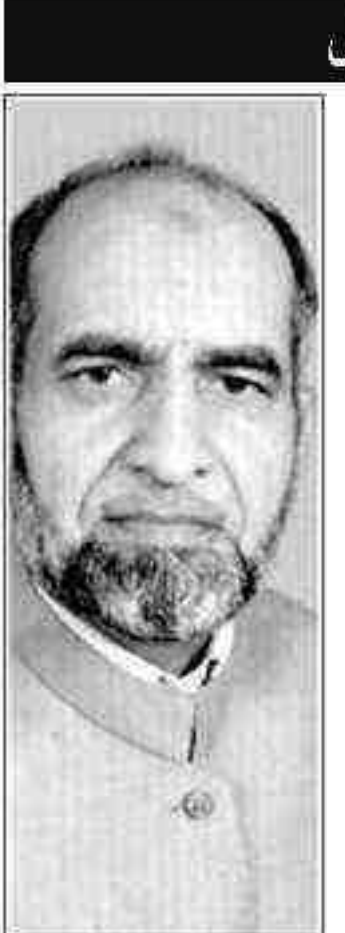

ہمارا دل ہمیں جینے کے سارے گر سکھاتا ہے
محبت خود سے کرنے میں بڑا ہی لطف آتا ہے

خدا نے ہے دیا جو کچھ مرے ماں باپ کے صدقے
مرے احساس میرے خون کی عظمت بتاتا ہے

خدا واحد رسول اللہ پر ایمان ہے تو پھر
صدائے حق کو آخر دل میں تو کیوں کر دباتا ہے

ہمیں جو درس دیتا ہے عبادت کا صداقت کا
یتیموں بے کسوں، اہلِ وطن کا حق بھی کھاتا ہے

گریباں دیکھ کر کچھ سوچ کر ہوتا پریشاں ہوں
یہ دل میرا کبھی جو جشنِ آزادی مناتا ہے

گریباں میں ذرا دیکھو فرشتہ تو نہیں ہے گل
لہو اپنا کہاں تو بھی چراغوں میں جلاتا ہے

گل بخشالوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہوا کی طرح صحرا سے گزر جا
سفر میں کیا سر و سامان رکھنا

غزل

صدی ہوں اور لمحوں میں مجھے تقسیم کر لینا
بکھر جاؤں تو حصوں میں مجھے تقسیم کر لینا

کبھی میری ضرورت ہو تو تنہائی میں پڑھ لینا
میں افسانہ ہوں لفظوں میں مجھے تقسیم کر لینا

مرے بیٹو! میں کچھ بھی تو نہیں لیکن بہت کچھ ہوں
محبت کے اثاثوں میں مجھے تقسیم کر لینا

انا کی جنگ لڑنے جا رہا ہوں تم دعا کرنا
جو بچ جاؤں تو اپنوں میں مجھے تقسیم کر لینا

مرے لفظوں کو اے اقبال پھر سے زندگی دینا
میں شاعر ہوں کتابوں میں مجھے تقسیم کر لینا

اقبال سروبہ

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

عمر بھر دکھ رگوں میں بھرتا ہے
جان لے کر ہی دل ٹھہرتا ہے

غزل

خواب میرے نہ نیند ہی میری
یعنی شب سے نہیں بنی میری

دیکھ! جھلسا نہ دے کہیں تجھ کو
دھوپ جیسی یہ زندگی میری

جل رہا تھا میں یوں اندھیروں میں
چاروں جانب تھی روشنی میری

تم دسمبر کی بات کرتے ہو
لے گیا جان جنوری میری

عمر بھر میرے ساتھ ساتھ رہی
دوست میری ہے بے گھری میری

تم خدا کو تلاش کرتے رہو
مجھ کو پانے دو آگہی میری

وقت آنے پہ اپنی سلگانا
آگ جلنے دو تم ابھی میری

خود کو دریافت کر رہا ہوں میں
دیکھنے دو مجھے کمی میری

تیرے آنے کا انتظار رہا
چائے تو ختم ہو گئی میری

کام آئی نہ پیاس میں کچھ بھی
ایک دریا سے دوستی میری

بھر گیا دشت باد صرصر سے
خاک صحرا میں وہ اُڑی میری

جب زبانوں پہ قفل پڑ جائیں
بات کرتی ہے خامشی میری

بے خودی کے مقام پر اشرفؔ
آڑے آتی رہی خودی میری

اشرف نقوی

غزل

سخن اُتارے ہوئے ہیں اُس نے ہزار مجھ میں
سجا رکھی ہے عجب طرح کی بہار مجھ میں

یہ میری آنکھوں کا دیکھنا بھی بتا رہا ہے
چھپا ہوا ہے کہیں ترا انتظار مجھ میں

تھکا دیا ہے مجھے سرابوں کی وسعتوں نے
کوئی سمندر کوئی جزیرہ اُتار مجھ میں

نہ چاہتے پر بھی لے کے جاتی ہے تری جانب
بنی ہوئی ہے اِدھر جو اِک رہگذار مجھ میں

پکارتا ہے یہ کون اس کو مری زباں سے
یہ کون ہوتا ہے اس قدر بے قرار مجھ میں

میں ریزہ ریزہ بکھر گیا ہوں تو کیسی حیرت
کئی زمانوں سے بھر رہا تھا غُبار مجھ میں

یہ کیا ستم ہے کہ دشمنوں میں کھڑا ہوا ہے
وہ جس نے اِک دن کیا تھا خود کو شمار مجھ میں

ریاض رومانی

غزل

ایسی ابرو کمان رکھتے ہو
دھڑکنوں کو جوان رکھتے ہو

پوچھ کر ہم سے بھی کبھی دیکھو
دل میں کیا کیا گمان رکھتے ہو

ایک ہم ہی تمھارے دل میں نہیں
یوں تو سارا جہان رکھتے ہو

آنکھیں ہر بات کہنے لگتی ہیں
بے زباں ہو زبان رکھتے ہو

میرا دل تو ہمیشہ توڑا ہے
کیا خبر کس کا مان رکھتے ہو

لاکھ حربے ہیں جان لینے کے
یوں تو نازک سی جان رکھتے ہو

کوئی آواز میں ہے جادو سا
ایسی شیریں زبان رکھتے ہو

ہم تو آئیں گے دستکیں دیں گے
آنکھ کیوں مہربان رکھتے ہو ؟

شہزاد احمد شیخ

غزل

چلو اتنی سی مجھ کو راحت تو ہے
کہ دل میں ترے میری چاہت تو ہے

ہنسی میں اُڑائے وہ ہر بات کو
بُری ہے یہ عادت پہ عادت تو ہے

یہی کافی ہے اب تو میرے لیے
مری اُس کی نظروں میں عزت تو ہے

غنیمت ہے یہ وہ مرے پاس ہے
میسر مجھے اُس کی قربت تو ہے

یہی سوچ کر ہو رہا ہوں میں خوش
اُسے آج بھی میری حاجت تو ہے

زبیر فاروق

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

ہجر کا غم کچھ اور ہے، آنکھ کا نم کچھ اور شے
زیرِ چراغِ آگہی نورِ ہُنر نہیں تو کیا

غزل

جو چاہو کھیل رچاؤ تمہیں اجازت ہے
اٹھاؤ نیچے گراؤ تمہیں اجازت ہے

میں آج اپنی کہانی تمہیں سناؤں گا
رقیب سارے بلاؤ تمہیں اجازت ہے

دیا ہوں، اور برابر ہے روشنی میری
کسی جگہ بھی جلاؤ تمہیں اجازت ہے

کہانی کار کا لہجہ تھکا نہیں ہے، ابھی
جلاؤ خوب الاؤ تمہیں اجازت ہے

تمہارے حسن کا غازہ بنے گی بالآخر
ہماری خاک اڑاؤ تمہیں اجازت ہے

اندھیری شب کا فسوں ٹوٹنا ضروری ہے
چراغ آگے بڑھاؤ تمہیں اجازت ہے

مبالغہ ہے مگر عشق میں یہ جائز ہے
ستارے توڑ کے لاؤ تمہیں اجازت ہے

شبِ وصال کے گیسو چمک اٹھیں شاہدؔ
نقاب رخ سے ہٹاؤ تمہیں اجازت ہے

افتخار شاہد

غزلیں

بھٹکنا پڑتا ہے کچھ انتظام ہونے تک
پرندے لوٹ ہی آتے ہیں شام ہونے تک

سنہری زلف سے اُلجھا ہوا ہے شہزادہ
کرے گا زعم وہ خود پر غلام ہونے تک

تمہارا مرکزی کردار ہے کہانی میں
ہمارے پیار کا قصہ تمام ہونے تک

ہمیں خبر ہی نہیں تھی خمار کیا شے ہے
گلابی مدھ بھرے ہونٹوں کے جام ہونے تک

نصیب اپنی جگہ ہے مگر حقیقت میں
کئی درد بیلنے پڑتے ہیں نام ہونے تک

یہاں کے لوگوں کی یہ بھی سرشت دیکھی ہے
بہت خلوص سے ملتے ہیں کام ہونے تک

تجھے اس عارضی شہرت سے کیا ملا ارشدؔ
تُو کتنا خاص تھا یاروں میں عام ہونے تک

ارشد محمود ارشد

رونے والوں کو دلاسا نہیں دینے آیا
خونی رشتوں کو وہ پُرسہ نہیں دینے آیا

باندھ رکھا ہے زمانے کی ہوس نے اُس کو
ماں کی میت کو بھی کاندھا نہیں دینے آیا

ہائے افسوس کہ نازوں سے تھا پالا جس نے
قبر کو اُس کی وہ کتبہ نہیں دینے آیا

راز کھلتا تو سہی، کس نے تھا لوٹا گھر کو
وہ فسانے کا خلاصہ نہیں دینے آیا

جو بھی ترکے میں ملا، سارا سنبھالا اس نے
میرے حصے کا وہ آدھا نہیں دینے آیا

حاکمِ وقت کے وعدوں کا بھروسہ کرلوں؟
روز کہتا ہے کہ دھوکا نہیں دینے آیا

اُس کے ہاتھوں میں رہی میری امانت ارشدؔ
مجھ کو میرا ہی اثاثہ نہیں دینے آیا

غزل

دنیا کو پھر یہ راز بتانا پڑا مجھے
تم بے وفا تھے پیار نبھانا پڑا مجھے

اک وقت تھا کہ فاصلے مٹتے چلے گئے
پھر کیا ہوا کہ بیچ زمانہ پڑا مجھے

ہر سمت میرے درد کے چرچے یہاں ہوئے
دنیا سے اپنا غم بھی چھپانا پڑا مجھے

وہ چھوڑنے کا عزم کیے تھا پھر اس لیے
کچھ دیر کو چراغ بجھانا پڑا مجھے

پھر اک صدائے درد جو ابھری تو مڑ لیا
وارفتگی تو دیکھیے آنا پڑا مجھے

طلعت شبیر

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

شہر کا حال اے ہوائے جمال
موجِ ریگِ رواں سے ملتا ہے

غزل

کیوں تذبذب میں گھرے ہیں، کس لیے مدہوش ہیں
ظلم کے بازار میں ، اہلِ نظر خاموش ہیں

فیصلہ کرنا ہے مشکل ، کیا انھیں درکار ہے
کس کی باتوں میں مگن ہیں، کیوں ہمہ تن گوش ہیں

حیثیت کس کی ہے کیا، اس کا کسے ادراک ہے
تیز تر کچھوے ہوئے ہیں، سُست تر خرگوش ہیں

جو ہزاروں میل سے پہنچا تری درگاہ پر
دیکھ اُس کے پاؤں میں ٹوٹے ہوئے پاپوش ہیں

میں تعشّق کر چکا ، اُن کی طرف سے دیر ہے
کن سے اُن کو تھا لپٹنا، کن سے ہم آغوش ہیں

پھر پھڑاتا ہی نہیں دل کے فلک پر کوئی اب
یاد کے پنچھی سبھی زیرِ زمیں رُوپوش ہیں

معتبر ہے سب کی نظروں میں مقام آفتاب
دیر سے اُس کی محبت میں سبھی پُرجوش ہیں

آفتاب خان

غزل

تشنگی کو بھوک کو غم کو جفا کو سونپ دی
ہم نے اپنی زیست دشتِ کربلا کو سونپ دی

میری مجبوری کو کیا بھاتی فضیلت کی سند
کر کے پرزہ پرزہ ہر ڈگری ہوا کو سونپ دی

شامِ مایوسی کو دے کر اس نے عنوانِ امید
پھر کتابِ فکرِ صبحِ خوشنما کو سونپ دی

بخش کر پرواز کو میری عروجِ آسماں
اس نے تاروں کی تجلی خاکِ پا کو سونپ دی

میرے سینے کو بنا کر شہرِ شور انگیز آج
اس نے اک تحریک مجھ درد آشنا کو سونپ دی

مانگے تھے اظہارِ غم کے واسطے بس چند لفظ
اس نے اقلیمِ سخن مجھ بے نوا کو سونپ دی

مہرباں آج اس قدر مجھ پر ہوا وہ سنگ دل
انتہا کی ساری لذت ابتدا کو سونپ دی

ذکی طارق

غزل

دے کر مجھے الفت کا یہ آزار، مرے یار
کر ڈالا مری زیست کو دشوار، مرے یار

یہ وادیٔ پُرخار ہے، ہر گام سنبھل کر
گر جائے نہ سر سے ترے دستار، مرے یار

دے گا مرا ماضی مری عظمت کی گواہی
ہوتا تھا مرا شعر ہی شہکار، مرے یار

کیا چیز پسِ پردۂ احوالِ جنوں ہے
کھل جائیں گے اک روز یہ اسرار، مرے یار

ہو جانے کو ہے ختم یہ ہستی کی مسافت
ہر شخص ہی چلنے کو ہے تیار، مرے یار

ہر سوچ یہاں زر کی پرستش میں مگن ہے
کوئی نہیں یوسف کا خریدار، مرے یار

میں ہی تھا ندیمؔ رہِ ہستی، سو مجھے بھی
کر ڈالا ترے عشق نے بے کار، مرے یار

ریاض ندیم نیازی

غزلیں

ایک اک کر کے غلط ہو گئے اندازے سب
کیسا دور آیا بکھرنے لگے شیرازے سب

جانے کیا بات ہوئی رسنے لگا اُن سے لہو
بھول ابھی لا کے جو رکھے تھے یہاں تازے سب

مٹ گئیں اہلِ جہاں کی سبھی چوٹیں لیکن
زخم جو تم نے لگائے تھے وہ ہیں تازے سب

آ جڑی تہذیب تو بازاری سا ماحول ہوا
اب تو اک دو جے پہ کسنے لگے آوازے سب

کس سے طاہر کہے اب جا کے کہ کیوں روٹھے ہو
بند کیوں ہو گئے ہیں یاد کے دروازے سب

طاہر ناصر علی

شجر محبتوں کا تھا اُگا ہوا
کبھی وہ گھر تھا چھاؤں سے بھرا ہوا
تھی در پہ اک پلیٹ سی لگی ہوئی
مکیں کا نام جس پہ تھا مٹا ہوا
چمن میں اب کی بار شاخِ نخل پر
سجائے گُل تھا زخم ہی کھلا ہوا
میں سوچتا ہوں اُس کی لو کو دیکھ کر
لہو سے اب دیا ہے یہ جلا ہوا
حسد کی آگ سے جلا کے آشیاں
وہ خود ہی کہہ رہے ہیں ہائے کیا ہوا

غزل

انصر حسن

نہ تیرگی سے زیادہ ڈرا شبِ یلدا
بجھے چراغ ہمارے جلا شبِ یلدا

تجھے گلا ہے فقیروں سے کیا شبِ یلدا
ابھی سے چھوڑ کے بگلی نہ جا شبِ یلدا

اسی میں راز ہے میری بقا کا پوشیدہ
اٹھا رہا ہوں جو فصلِ فنا شبِ یلدا

ترے بغیر ملے گا ہمیں قرار کہاں
نہ ہم سے روٹھ نہ دامن چھڑا شبِ یلدا

مرے مزار پہ ہنسنا ترا نہیں بنتا
مرے مزار پہ آنسو بہا شبِ یلدا

ہمارے ساتھ سویروں کو دیکھ کر انصر
رہے گی ہم سے ہمیشہ خفا شبِ یلدا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نقشِ طلب ربط سر و سنگ ہے
قطرۂ خوں ، خانۂ ارژنگ ہے

غزل

عشق کی آگ سے جب گزارے گئے
آسماں سے زمیں پہ اتارے گئے

ٹوٹی ناؤ کو ہم نے بھی چھوڑا نہ تھا
ساتھ جب تک ہمارے کنارے گئے

ہر قدم پر تھی درپیش تیری کمی
حشر تک ساتھ اپنے خسارے گئے

دستِ نازک سے اٹھتا نہ خنجر کبھی
ہم محبت میں مارے گئے

ہم نے جھکنے سے انکار جب کر دیا
اس کی پاداش میں سر اتارے گئے

کتنے مسرور تھے نیند میں ہم حکیم
خواب ٹوٹا تو سارے نظارے گئے

حکیم خان حکیم

غزل

اُس طرف جانا تو ہے، دریائے غم رستے میں ہے
اک قدم منزل کی جانب، اک قدم رستے میں ہے

ایک تو دل میں ہے میرے، دوسرا آنکھوں میں ہے
اور اُس کا کیا کروں میں جو صنم رستے میں ہے

اُس تھکے ہارے ہوئے کا حوصلہ بھی خُوب ہے
وہ تو سَر جھایا ہوا بھی تازہ دَم رستے میں ہے

مَیں تو پہلے جیسے تیسے گھر پہنچ آیا مگر
اب پلٹ کر دیکھا ہے تو چشم نم رستے میں ہے

خالی کاغذ سامنے رکھے ہوئے بیٹھا ہوں مَیں
شعر لوحِ ذہن پر ہیں اور قلم رستے میں ہے

اُس کے ملنے کی کوئی اُمید تو جاگی ظہورؔ
دل اِسی میں خوش ہے کہ وہ کم سے کم رستے میں ہے

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اس مرگِ مسلسل سے اب اُکتا سے گئے ہیں
پَل پَل میں رواں پھر وہی سرطان سا دن ہے

غزل

گلوں کی مہک سے معطر چمن ہے
گلستاں کی ہر شے خوشی میں مگن ہے

لہو رنگ بہتے ہوئے آنسوؤں سے
بدن بھیگا بھیگا ہے تر میرا من ہے

مرے گلشنِ دل میں کھل ہیں ہزاروں
انھیں میں گل و لالہ و نسترن ہے

اِدھر میں پریشاں اُدھر مضطرب وہ
یہ کیسا ملن ہے یہ کیسی لگن ہے

کبھی کوئی اس پر نہ انگلی اُٹھائے
محبت کا اپنا الگ ہی چلن ہے

نکل پڑتا ہے بے ارادہ سفر پر
مرے من کا گویا یہ آوارہ پن ہے

کہانی غموں کی رقم کر رہا ہے
بدن پر جو پہنا ہوا پیرہن ہے

خوشی کم محبت میں غم ہیں زیادہ
یہ دنیا تو شاداؔب دار المحن ہے

شاداب صدیقی

غزل

چپ کی تمہارے لب نے اجازت نہ دی ہمیں
اظہار کی نسب نے اجازت نہ دی ہمیں

ہم باز کر چلے ہی تھے آئندگی کا قفل
اِک ساعتِ عجب نے اجازت نہ دی ہمیں

مشکل نہ تھا کہ ہم رُخِ مطلوب دیکھتے
اِس کام کی طلب نے اجازت نہ دی ہمیں

لے آیا تھا خمار بہت سجدے کے قریں
پھر یوں ہوا کہ رب نے اجازت نہ دی ہمیں

اسباب تھے ہزار تبسم کے باب میں
اِک رنجِ بے سبب نے اجازت نہ دی ہمیں

یہ جانتے ہیں کس کی اجازت سے کی خطا
کہنے کی پر ادب نے اجازت نہ دی ہمیں

بندِ قبائے رازِ سحر کھولتے تو تھے
لیکن عروسِ شب نے اجازت نہ دی ہمیں

حسنین سحر

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

تیرے اوصاف فقط تجھ سے بیاں ہوتے ہیں
نعت خود لکھی ، بہ پیرایۂ سیرت لکھی

غزل

اک زمانے کا حالِ دل ہے عیاں
دشت ہے مجھ کو بس یہاں سے وہاں

میں نہیں اس دیار میں تنہا
داستاں بھی ہے میرے ساتھ رواں

میں اگر سامنے سے ہٹ جاؤں
پھر تو خالی ہے دامنِ امکاں

لوگ رکھتے ہیں یادِ یارِ عزیز
لے چلوں میں بھی اپنے ساتھ دھواں

اس گلی کے لیے اٹھا رکھوں
رت جگے اور آبلوں کے نشاں

شہر کے انتظام سے باہر
اک گلی ہو برائے دل زدگاں

تم رہو گئے زمانے کی لَے پر
اور زمانہ ہمارے ساتھ رواں

شہر آوارگاں سے خالی ہے
ڈھونڈیے اب صدائے ہم نفساں

روشنی روشنی کا پہناوا
دیدہ ور ہیں برائے دیدہ وراں

ہمیں تسخیر کرنے والوں کی
بات اپنی کوئی نہ اپنی زباں

وہ جسے روح میں اترنا تھا
کیا اُٹھاتے اسے سرِ مژگاں

سبطین رضا

غزل

دل سے نکلا ہوا جو حرفِ دعا جاتا ہے
دور افلاک سے آگے بھی چلا جاتا ہے

کبھی ہستی کے اَلم ہیں کبھی مخلوق کے غم
دکھ بہانے سے مری گود میں آ جاتا ہے

لے گیا دور زمانے سے مجھے شوق طلب
ورنہ صحرا میں کہاں آبلہ پا جاتا ہے

اپنی تقدیر میں ترمیم ذرا سی چاہوں
مرے کاتب! ترا اس بات سے کیا جاتا ہے

زندگانی میں ترے دم سے ہے رونق ہر سُو
تو نگاہوں سے کہاں دُور ہوا جاتا ہے

زہر سے زہر کا تریاق بنا کرتا ہے
جس سے مرتے ہیں وہی درد بچا جاتا ہے

مشعلیں لے کے وفا ڈھونڈ رہی ہے دنیا
یہ قیامت کی نشانی ہے کہا جاتا ہے

خود پہ حیرت ہے کہ اب تک نہیں سیکھا فیصلؔ
آنکھ پُرنم ہو تو خوش کیسے رہا جاتا ہے

فیصل زمان چشتی

غزل

زمیں کے ہوتے ہوئے آسماں سے پیار نہیں
بیان اچھا ہے لیکن یہ سازگار نہیں

گمان یہ ہے تمہیں دسترس میں کر لوں گا
یقین یہ ہے کہ خود پر بھی اختیار نہیں

ہوا نے باندھ لیا اپنے ساتھ اڑا لے گئی
میں اڑ رہا ہوں مجھے پیار سے پکار نہیں

میں ہنس رہا ہوں تو اس کی یہاں ضرورت تھی
مجھے خوشی ہے مرے سر پہ تو سوار نہیں

ابھی کچھ اور بگڑنے ہیں اس کے خال و خد
خزاں رسیدہ شجر پر ابھی بہار نہیں

تری رضا سے مجھے ہر خوشی میسر ہے
سو اس لیے تو مجھے امتحاں سے مار نہیں

نعیم رضا بھٹی

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

کوئی پوچھے تو کہیں غیر تھا یا اپنا تھا
ایک چہرے کے سوا شہر میں کیا اپنا تھا

غزلیں

پھر آج ذہن سے میرے نکل گیا، رکھ کے
میں دل میں بھول گیا ہوں کہیں خدا رکھ کے

بس ایک جست کی دوری تھی جب بھی دل نے کہا
فلک پہ چڑھ گیا پاؤں تلے ہوا رکھ کے

کہاں گئے ہیں خریدار جانے؟ آج فقیر
کھڑا ہے دیر سے ہاتھوں پہ اک دعا رکھ کے

میں شور چھان رہا ہوں کسی صدا کے لئے
پرکھ رہا ہوں صدائیں جدا جدا رکھ کے

وگرنہ روشنی کافی اُدھڑ گئی ہوتی
کہ کردی وقت پہ میں نے رفو دیا رکھ کے

اک آدھ لے ہی گیا ہو نہ دل سے جاتے ہوئے
سو اپنی دھڑکنیں بھی دیکھ لوں ذرا رکھ کے

عزم الحسنین عزمی

وہ جب بھی حکم کرے مجھ کو دھر لیا جائے
ملے نہ جرم تو کچھ فرض کر لیا جائے

بدن میں ہی نہیں سائے میں بھی مقیم ہوں میں
کھڑا ابھی ہوں تو مجھے خاک پر لیا جائے

چلو یہ سوچ کا کچھ بوجھ بانٹ لیں ایسے
کہ دل کو بیچ کے اک اور سر لیا جائے

خلوص سود پہ دیتا ہوں صاحبو سن لو
میں لوں گا دوگنا یہ جس قدر لیا جائے

چرا رہا تھا ابھی تک سو کم لیا ہے تجھے
تو اذن دے تو تجھے بیشتر لیا جائے

ہوا کی ریت میں رِس جائے گی یہ بات کی بوند
اسے دماغ کی بوتل میں بھر لیا جائے

غزل

جہانِ حرف کی جانب جھکاؤ تھا ہی نہیں
سخنوری سے کچھ اُس کو لگاؤ تھا ہی نہیں

ہمیں تو خاک اڑانی تھی، بس اڑا آئے
ہمارا دشت میں کوئی پڑاؤ تھا ہی نہیں

میں رو پڑا یہ بتاتے ہوئے ”میں جب لوٹا“
وہ لوگ، خیمے، وہ جلتا الاؤ تھا ہی نہیں

وفا میں جاں سے نہ جاتے تو اور کیا کرتے
ہمارے پاس کوئی اور داؤ تھا ہی نہیں

اسی لیے مرے حصے میں آئی جنسِ وفا
لگا دیا تھا جو میں نے وہ بھاؤ تھا ہی نہیں

ہوا کے ایک ہی جھونکے نے توڑ ڈالا اسے
وہ خشک شاخ کہ جس میں جھکاؤ تھا ہی نہیں

ہماری ناؤ کو منزل سے دور کر دیتی
کسی بھی موج میں ایسا بہاؤ تھا ہی نہیں

معاملات ہوئے طے تو یہ کھلا آصف
ہمارے بیچ تو کوئی تناؤ تھا ہی نہیں

آصف شفیع

غزلیں

دل گرفتہ تو نہیں راہ کی ویرانی پر
میں کہ نازاں ہوں بہت بے سروسامانی پر

کب ملا اذنِ رہائی کسی پنچھی کو یہاں
درِ زنداں کھلا کب کسی زندانی پر

کوئی دیوار سلامت ہے نہ دروازہ کوئی
کس کو مامور کیا اپنی نگہبانی پر

دیر لگتی نہیں کچھ وقت بدل جانے میں
اتنا اتراؤ نہ اس خلعتِ سلطانی پر

بے یقینی کے زمانے میں پلٹ آیا ہوں
گرد سی ڈال کے میں لمحہ امکانی پر

جانے کس موڑ پہ لائی ہے مجھے تیری طلب
داغ دامن کے ابھر آئے ہیں پیشانی پر

چاند تھا موج میں خورشید جہاں تاب بھی تھا
میں کہ قربان ہوا حُسن کی تابانی پر

وسیم عباس

یہ جو سینے میں اک دباؤ ہے
یادِ ماضی کا کوئی گھاؤ ہے

اب کہاں شدتیں محبت میں
صرف دنیا میں رکھ رکھاؤ ہے

رات ٹھہری ہوئی ہے کمرے میں
چند غزلیں ہیں اک الاؤ ہے

جی رہا ہوں میں اس بھروسے پر
مجھ سے اک شخص کو لگاؤ ہے

آرزوؤں پہ پھر گیا پانی
موج در موج وہ بہاؤ ہے

ایسے ٹوٹا ہے ساحلِ امید
جیسے دریاؤں کا کٹاؤ ہے

اب کہاں احترام رشتوں کا
اب کہاں پہلا رکھ رکھاؤ ہے

غزلیں

ہاتھ فلک پر، پاؤں زمیں پر، جور و جفا کے ساتھ
چلنے والے چل پڑتے ہیں ایک ہوا کے ساتھ

سوئے فلک جو ہاتھ اٹھا کر اب فریاد کرو
باندھ کے رکھنا لاکھ پروں کو حرفِ دعا کے ساتھ

دین دھرم کو سستے داموں بیچنے والے لوگ
ننگِ چمن کو بیچ نہ ڈالیں نامِ خدا کے ساتھ

دستکیں دیتے دیتے لاکھ دلوں کے در پر میں
اپنے اندر گونج اٹھا ہوں اپنی صدا کے ساتھ

آنکھ تماشہ گر دیکھے دل کی بینائی سے
حسن چمک پڑتا ہے دل میں اور ضیا کے ساتھ

شام افق پر، صبح فلک پر، رات غروب کہیں
سوچ کا سورج بہہ جاتا ہے زرد قبا کے ساتھ

رختِ سفر میں اور بھلا ہم کیا کیا باندھ رکھیں
چند سخن سامان میں ہیں پیمانِ وفا کے ساتھ

حمزہ ہاشمی سوز

شاخِ گل کھلتی چلی جائے گلستاں کی طرح
مجھ سے لپٹے تری خوشبو ترے پیماں کی طرح

ایک اک دعویٰ فرشتوں کی طرح کرتے جائیں
اب تو ملتے نہیں انسان بھی انساں کی طرح

عمر بھر طعنہ زناں مجھ پہ رہے یار سبھی
عمر بھر چال چلے بزمِ حریفاں کی طرح

دل کے خاموش بیاباں میں نہ یوں شور کرو
جاگ اٹھے نہ قیامت کوئی طوفاں کی طرح

چار و ناچار مری سمت پلٹ آتی ہے
خواہشِ قرب بھی اسکی غمِ دوراں کی طرح

نکہتیں بڑھتی رہیں تیرے شبستانوں کی
تو بھی آباد رہے حلقۂ یاراں کی طرح

ابھی شاداب لفظوں کی پس انداز رکھو
آئیں گی کام کسی دن سرو ساماں کی طرح

غزل

یہ ترے مزاج کی تلخیاں کہیں رنجشوں کو ہوا نہ دیں
تو کہے اگر تو کبھی کبھی کا یہ رابطہ بھی گھٹا نہ دیں

ملے اب تو جاں کو کہیں اماں رہیں کب تلک یونہی بے اماں
وہ جو خواب تھا کسی آنکھ کا اسے خواب سے ہی مٹا نہ دیں

تجھے جب ملیں کبھی فرصتیں تو یہ بیٹھ کے ذرا سوچنا
کہ بنے ہوئے ہیں جو راہبر وہی بستیوں کو جلا نہ دیں

کہیں کس سے اپنی یہ داستاں جسے دیکھو وہ ہے دکھا ہوا
یہ جدا مزاج کے لوگ ہیں تجھے پستیوں سے ملا نہ دیں

ہے عجب طرح کی یہ بے کلی نہیں چین ایک بھی پل مجھے
کہ تری انا کے یہ مسئلے کہیں دکھ کا جال بچھا نہ دیں

تو ذرا سنبھل کے اٹھا قدم نہ سمجھ یوں خود کو ہی عقل کل
مرے دوست ترے حبیب ہی تجھے راستے میں دغا نہ دیں

نائلہ راٹھور

انتخاب

— خالد احمد —

ہر قدم تجھ سے نئی دوری کا غم پائیں گے ہم
حادثوں کی سیڑھیاں چڑھتے چلے جائیں گے ہم

نعمان منظور

غزل

پلٹتے جاتے ہیں سب پرندے کہ شام کو پر لگے ہوئے ہیں
کسی کی آنکھیں ہیں راستے پر کسی کے دفتر لگے ہوئے ہیں

وہ آ کے عہدِ جفا سے ہم کو وفا کی رمزیں سکھا رہے ہیں
جو کل محبت میں طفلِ مکتب تھے ہم پہ افسر لگے ہوئے ہیں

یہ عشق والوں کی جامعہ ہے سو بر میرٹ ہے داخلے کا
ہماری مسند کی بات چھوڑو کہ ہم تو پڑھ کر لگے ہوئے ہیں

اگر یہ دعویٰ ہے تم نے رستے کی خاک ہم سے زیادہ چھانی
بتاؤ کتنے ہزار منزل کے میل پتھر لگے ہوئے ہیں؟

غبارِ ہجراں کا سب فسانہ تمہاری آنکھیں سنا رہی ہیں
ہمیں اذیت کی آگہی ہے ہمیں یہ نشتر لگے ہوئے ہیں

دنیا کی لوگوں سے معذرت جو بدن کو منزل سمجھ رہے ہیں
یہ جسم کہکشا پہ چلنے والے تمہارے دلبر لگے ہوئے ہیں

عاطف جاوید عاطف

انتخاب

خالد احمد

شکل شکل زندانی، ہجر بے رخی کی ہے
آرزوؤں کی بستی میں، دھوم سامری کی ہے

نعمان منظور

غزلیں

پھول چہرے پر وہ اشکوں کو مسلتی ہی رہی
آگ آہوں کی مگر من میں بھڑکتی ہی رہی

اک تبسم اس کی رعنائی سے کچھ کہتا رہا
اک ہنسی میرے لبوں پر بھی مہکتی ہی رہی

ریل کی سیٹی بجی اور وہ جدا ہونے لگا
چیخ اک سینے میں دب کر پھر مچلتی ہی رہی

اس کی باتوں میں نشہ تھا حسن کے سب تیر ان تھے
دیر تک بادِ صبا گلشن میں چلتی ہی رہی

عشق کے آزار یارو کس قدر سنگین تھے
جان پر ہر لمحہ آفت کوئی بنتی ہی رہی

یہ انا قاتل ہے میری بات کو تم مان لو
یہ بلا معصوم جانوں کو نگلتی ہی رہی

خامشی سے بہہ رہا ہے جس طرح آبِ رواں
زندگی اپنی شہابؔ ایسے گذرتی ہی رہی

شہاب اللہ شہاب

عجب تھیں ذائقے کی لذتیں شیریں زبانوں میں
جو آوازیں کبھی رس گھولتی تھیں میرے کانوں میں

کبھی یادوں کی تتلی غم کے دن میں رنگ بھرتی تھی
کبھی اُمید کے جگنو تھے دل کے گلستانوں میں

کبھی ایسے کھڑا رہتا تھا کوئی منتظر تیرا
دہاڑی کے لیے مزدور جیسے کارخانوں میں

وہ وحشت کی طرح سے بولتی ہے میرے کمرے میں
سجا رکھی ہے جو تصویر الماری کے خانوں میں

ابھی تک بھی تخیل میں اُبھرتے ہیں کئی چہرے
ابھی تک بھی مقید ہیں نگہ کے قید خانوں میں

یہاں ہر شخص اپنے رنگ میں اس کو بیاں کرتا
کہ وہ سچی کہانی دب گئی کتنے فسانوں میں

تبسم وہ گیا تو لوٹ کر واپس نہیں آیا
پرندے تو پلٹ آتے ہیں شب کو آشیانوں میں

وجاہت تبسم

غزلیں

ازل سے روشنی کے درمیاں ہے
فقیروں کا تو اپنا ہی جہاں ہے

خزانوں سے بھری جھولی ہے میری
مقدر کا لکھا وہ سب یہاں ہے

مجھے لینا ہے اب تعویذ اس سے
محبت کا پتا وہ گھر کہاں ہے

سنا اردو کے بارے میں ہمیشہ
یہ اک تہذیب سے میٹھی زباں ہے

وہ ماضی مٹ چکا ڈھل بھی گیا اب
تبھی یہ جبر بے نام و نشاں ہے

امجد بابر

رنجور غم سے دل مرا ٹوٹی ہے آس بھی
اک تشنگی ہے راستہ دریا کے پاس بھی

آیا نہیں خیال کا جھونکا ادھر تو کیا
لفظوں سے چھیڑ چھاڑ نہیں مجھ کو راس بھی

لے آؤں میں رقیب کو گھر میں ذرا حضور
خوش ہوگا اس سے وہ مرا مہمان خاص بھی

مت پوچھ تیرے بن مرا کیسا ہے اب چمن
یہ پھول بھی اداس ہیں روتی ہے گھاس بھی

ایسی لگی ہے آگ کہ سب کچھ ہی جل گیا
امید رسوا ہو گئی بجھی ہے پیاس بھی

غزلیں

کوئی بھی چال چلتا ہے تو چلنے دو زمانے کو
نگاہوں میں مگر رکھنا محبت کے خزانے کو
مری آنکھو! ذرا تم بھی تو سو لو کچھ تھکن ٹوٹے
ابھی راتیں بہت ہیں رتجگوں کے دکھ اٹھانے کو
کبھی جھکڑ کبھی آندھی کبھی برق آن پڑتی ہے
بناؤں میں بھلا کیا حسرتوں کے آشیانے کو
خزانوں کی طرح تو لاکھ پردوں میں تھا پوشیدہ
تجھے تقسیم خود ہونا پڑا جلوہ دکھانے کو
فراتِ درد کی موجوں میں یوں الجھا ہوں صدیوں سے
ہوا چلتی نہیں کوئی کنارے سے لگانے کو

سرور فرحان

بھاری شب کے بعد سورج کا اُجالا دیکھیے
زندگی کا ایسے پیراہن بدلنا دیکھیے
خود ہی جب کربل کے صحرا میں اتارا ہے مجھے
اب یزیدی خنجروں سے سر بھی کٹنا دیکھیے
فصلِ گل سے رابطوں پر بھی رہی ہر دم بہار
پھر بھی کشتِ خواب میں صحرا کا نقشہ دیکھیے
چل دیے وہ بحرِ غم میں بے سہارا چھوڑ کر
جانے کیا انجام ہوتا ہے ہمارا دیکھیے
جو ہماری جان تھا وہ شہر سے رخصت ہوا
کیا نکلتا ہے امیدوں کا نتیجہ دیکھیے

بظاہر دل سلگتا ہے فراقِ یار سے ہر دم
پسِ پردہ بہت کچھ اور ہے اس کے جلانے کو
مری دھرتی محبت کے سوا کچھ دے نہیں پائی
پرائے دیس ہی جانا پڑا روزی کمانے کو
تمھاری یاد تو لیتی نہیں ہے نام جانے کا
کبھی پھرتے پھراتے تم بھی آجاؤ نہ جانے کو
محبت تیر و ترکش اور محبت ہی کماں فرحانؔ
خطا ہونے نہ دینا تم کبھی اپنے نشانے کو

چھوڑ دیں فرحانؔ ان ویرانیوں کو دیکھنا
مسکراتا، کھلکھلاتا اس کا چہرہ دیکھیے

غزل

جب خرد کا چراغ جلتا ہے
دیدہ ور کروٹیں بدلتا ہے

کوئی جادہ ہو کوئی منزل ہو
غم مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

کام آتا نہیں کسی کا خلوص
گر کے خود آدمی سنبھلتا ہے

جا رہے ہو تسلیاں دے کر
دل کہیں اس طرح بہلتا ہے

کانپتا ہے وفا کے نام سے دل
جب کوئی بے وفا نکلتا ہے

کوئی ارمانِ دل نہیں نکلا
اسی حسرت میں دم نکلتا ہے

جا رہا ہے کوئی بغیر ملے
منظرِ زندگی بدلتا ہے

رومی ہونٹوں پہ کھیلتی ہے ہنسی
دل میں طوفانِ غم مچلتا ہے

دل کو تیری لگی ہوئی ہے لو
یہ بھی مثلِ چراغ جلتا ہے

کوئی ہمراہ شوق کر کے مجھے
ہر قدم ساتھ ساتھ چلتا ہے

وقت کو کروٹیں بدلنے دو
نظمِ عالم ابھی بدلتا ہے

رومانہ رومی

غزلیں

اسی سبب سے مری آبرو سلامت ہے
کہ میرے سامنے میرا عدو سلامت ہے

بچا ہوا ہے ہر اک فرد قتل ہونے سے
مرے قبیلے میں اک صلح جو سلامت ہے

جڑا ہوا ہوں بزرگوں کی ہر روایت سے
تبھی تو مجھ میں محبت کی خو سلامت ہے

یہی سبب ہے کہ تنہائی کا نہیں احساس
کسی کا ہجر مرے چار سو سلامت ہے

کسی کے زخم ابھی تک نہیں بھرے ہیں علی
کسی کے دامن دل کا رفو سلامت ہے

محمد علی ایاز

کوئی جسم جیسے زمین کھینچتی ہے
مرے دل کو اک نازنیں کھینچتی ہے

فلک سے زمیں پر میں آ تو گیا ہوں
مگر فطرت اولیں کھینچتی ہے

ادھر خواہش نفس کھینچے ہے مجھ کو
ادھر مجھ کو تعلیم دیں کھینچتی ہے

میں جتنی بھی کوشش کروں بھولنے کی
تو اتنی وہ زہرہ جبیں کھینچتی ہے

جھکے ہے جبیں جب بھی سجدے کو شافی
تری یاد آ کر وہیں کھینچتی ہے

محسن رضا شافی

غزلیں

باتوں سے کھلے گا نہ اشاروں سے کھلے گا
یہ رازِ محبت تو رویوں سے کھلے گا

اشعار کے پردے میں چھپائیں گے اسے ہم
تشبیہ سے، رمزوں سے، کنایوں سے کھلے گا

خوشبو ہی کرائے گی گلابوں کا تعارف
ہم کتنے سخن فہم ہیں شعروں سے کھلے گا

کس وجہ زمانے سے اسے خوف ہے لاحق
ظاہر میں ہے بے باک، حجابوں سے کھلے گا

ہم ڈھونڈیں گے خط کھینچ کے پھیلاؤ کا مرکز
وہ دائرہ در دائرہ نکتوں سے کھلے گا

وابستگی کچھ اور ہے منزل کی طلب اور
پاؤں سے لپٹتے ہوئے رستوں سے کھلے گا

پرتوں میں ازل سے ہے چھپایا ہوا جاذبؔ
صدیوں کا یہ عقدہ کہاں لمحوں سے کھلے گا

اکرم جاذب

ہوتے کبھی نہیں ہیں اندھیروں میں ختم چراغ
دیدہ وروں کا رکھتے ہیں قائم بھرم چراغ

کرتے ہیں تار تار شبِ تار کا لباس
جگنو، ستارے، خواب، تصور، قلم، چراغ

ظلمت میں بھولنے نہیں دیتے ہیں راستہ
ماں جی کے بن گئے ہیں نشانِ قدم چراغ

قائم وقار ان سے ہی انسانیت کا ہے
روشن ہیں آگہی کے اٹھائے علم چراغ

کرنیں حقیقتوں کی سبھی سو بکھر گئیں
جاذبؔ بھڑک کے بجھ گئے جب ایک دم چراغ

غزل

رات سر پر کھڑی
دور ہے گھر ابھی

پھول پھر خاک ہے
جب گئی تازگی

بڑھ گئی تیرگی
کیا ہوئی روشنی؟

کیا ملا شیخ کو
ماسوا بندگی

ساتھ رہتے ہوئے
ہم رہے اجنبی

اک نظر اور بس
جام ہے آخری

خود سے ڈرنے لگا
آج کا آدمی

آنکھ تھی منتظر
منتظر رہ گئی

ہے میسر کسے؟
چین کی اک گھڑی؟

غم کدہ ہے فقط
نام ہے زندگی

ہاں منافق ہیں سب
بات سچ ہے یہی

محمد آفتاب تابش

غزلیں

محبت لفظ جب دیکھے، مٹا دیتا ہے اکثر
نہ جانے کس کو وہ ایسی سزا دیتا ہے اکثر

سفیرِ صبح ایسے شخص کو رکھا گیا ہے
دِیے بھی جو شبِ غم میں بجھا دیتا ہے اکثر

وہ کم آمیز ہے یا بیوفا ہے، جانے کیا ہے
وہ پیمانِ محبت کو بھلا دیتا ہے اکثر

سرایت کر گیا ہے جانے کس کا درد اُس میں
وہ جب بھی بولتا ہے تو رُلا دیتا ہے اکثر

وہ جب بھی آئینے میں دیکھتا ہے اپنی صُورت
نئے فتنے دلوں میں وہ جگا دیتا ہے اکثر

وہ اِتنا سادہ دِل سادہ طبیعت کا ہے یارو!
وہ دِل کے راز لوگوں کو بتا دیتا ہے اکثر

عجب اِک خُو بنا ڈالی ہے اُس نے آج کل تو
جہاں بھی پھول وہ دیکھے، جلا دیتا ہے اکثر

گئے لوگوں کی صُورت کب پلٹتی ہیں صدائیں
جنوں آموختہ دِل کہ صدا دیتا ہے اکثر

محبت پہ جو نازاں ہوں تجھے حیرت ہے قائل
وہ خُود ہی تو مجھے ایسی ادا دیتا ہے اکثر

عمر فیاض قائل

اے ماہ رو نقاب اُٹھا کچھ خیال سے
چھایا ہے اک نشہ میرے دل پہ جمال سے

باہر نکل کے آئے حسین دل نگر سے خود
ساقی شراب ہجر ملا دے وصال سے

ہم کو نہ چھیڑ گردشِ دوراں کہ خیر ہو
ہم وجد میں لے آئیں زمیں اک دھمال سے

چولا اداسیوں کا بدن سے لپیٹ کر
لذت سی آ رہی ہے بہت اب مَلال سے

زاہد لگاتا قُفل ہے ذہنوں پہ کس لئے
آتا ہے کتنا خوف تجھے اک سوال سے

دیکھا ہے ڈوبتے ہوئے کیوں آفتاب کو
ڈرنے لگا ہے اب تو میرا دل زوال سے

مرنے کے واسطے جیے چل چل مُعان جی
کافی ہے زندگی بھی یہاں کس کمال سے

عامر مُعان

غزل

ہم نے جس خواب کو تعبیر کا امکان دیا
حیف اس خواب نے اکثر ہمیں نقصان دیا

ایک آسیب کی فرقت میں نظر آیا مجھے
رات ویران سرائے میں پریشان دیا

پہلے تو شہر کے سب خواب جلائے اس نے
اور پھر راکھ کو تعبیر کا عنوان دیا

آسمانوں سے زمینوں کے سفر میں اس نے
خاک کا جسم دیا، خواب کا سامان دیا

دل میں اک شخص کے رہنے کی اذیت مت پوچھ
دل نے اوقات سے بڑھ کر مجھے مہمان دیا

چاندنی رات کے منظر کا اثر جانے لگا
دل نے جب خاص ستارے پہ ذرا دھیان دیا

یہ اشارہ تھا کہ وہ مجھ کو سمجھ سکتی ہے
اس نے تحفے میں مجھے میرؔ کا دیوان دیا

زندگی! تیری عنایت ہے کہ دیوانے کو
چاک کرنے کے لیے ایک گریبان دیا

یہ قیامت کی نشانی تو نہیں ہے اسحاقؔ
کل اندھیرے سے ملا گھر کا نگہبان دیا

اسحاق وردگ

غزلیں

سورج پہ ساری دنیا ہی اُنگلی اُٹھائے گی
جب وہ کڑکتی دھوپ میں چھتری اُٹھائے گی

ہر بار اِس خیال سے ترکِ وفا نہ کی
کیسے یہ ہجر چاندسی لڑکی اُٹھائے گی

ہم ہیں اُو تراب کے حُب دارے جہاں!
دنیا ہماری قبر سے مٹی اُٹھائے گی

یونہی اگر حقوق پہ ڈاکہ پڑا رہا
عورت علم اُٹھائے گی برچھی اُٹھائے گی

بس میں نہیں اُٹھاؤں گا مشعل تمام رات
میری نظر چراغ کی لو بھی اُٹھائے گی

اگلے دنوں کا سوچ کے گھبرا گیا ہوں میں
جب نسلِ نو کتاب نہ تختی اُٹھائے گی

جنگل میں رات خوف سے جاگوں گا دیر تک
اور صبح کی ہوا مجھے جلدی اُٹھائے گی

اُس بے وفا کے کوچہء ظلم و ستم سے خلق!
جس جس کو بھی اُٹھائے گی زخمی اُٹھائے گی

کرنے لگوں گا شہر میں اِک پیڑ کی تلاش
ازور جب اپنے صحن سے گرمی اُٹھائے گی

ازور شیرازی

گزشتہ شب کی ہر اک داستاں بھی رکھتا تھا
چراغ اپنے بدن میں دھواں بھی رکھتا ہے

ترے خلاف کوئی لفظ بول نہ پایا
میں اپنے منہ میں اگرچہ زباں بھی رکھتا تھا

عجیب دن تھے محبت میں بے خودی کے دن
کہ بھول جاتا تھا جو شے جہاں بھی رکھتا تھا

کسی کے عشق میں غرقاب ہونے سے پہلے
میں اپنی روح بھی رکھتا تھا، جاں بھی رکھتا تھا

مجھے زمین کی تقسیم کھا گئی ورنہ
میں ایک دور میں ہندوستاں بھی رکھتا تھا

کسی بشر کی پیادہ روی کو ترسا ہوا
یہ روڈ سینے پہ کچھ لاریاں بھی رکھتا تھا

غزلیں

عقیل عباس

اس نے چھونے کا اشتراک کیا
مجھ سے ناپاک کو بھی پاک کیا
میرے سینے میں کچھ غلاظت تھی
ایک دن اُس نے اس کو چاک کیا
جیسے محرابِ مسجدِ اقصیٰ
ہم نے اس کو گنوا کے خاک کیا
ایک بس عشق ہو سکا ہم سے
بس یہی کام ٹھیک ٹھاک کیا
اس نے جھٹ سے گرا دیا پردہ
اور کمرے کو خوابناک کیا
خیر مقدم کیا محبت کا
حسبِ توفیق پرتپاک کیا
گھاٹیوں میں اترتے سورج نے
کتنی شاموں کو دردناک کیا
آخرش لگ گئے ٹھکانے ہم
ہم کو بھی ہم ہی نے ہلاک کیا

علی آرش

کب کہا اس سے آشنا ہوں میں
اس کی صورت بھلا چکا ہوں میں
جانے والے پلٹ کے دیکھ مجھے
تجھے آواز دے رہا ہوں میں
اس پری وش سے بات کرتے ہوئے
اس کی باتوں میں کھو گیا ہوں میں
رفتگاں کی اجاڑ بستی میں
رات بھر کس کو ڈھونڈتا ہوں میں
خواب کی وادیوں میں کل آرشؔ
اس حسیں شخص سے ملا ہوں میں

غزلیں

دیکھ میرے نگر نہیں آئی
اک کرن بھی ادھر نہیں آئی

آ گئی بچے کی دوا آخر
ہاں مگر وقت پر نہیں آئی

اسی نکتے سے ہی تھا سارا بگاڑ
سوچ میری جدھر نہیں آئی

ہے عجب سا ہراس گلشن میں
کوئی تتلی نظر نہیں آئی

کونسی وہ بلا ہے جو میرے
شہر مظلوم پر نہیں آئی

ابھی اک قتل کا سنا احمدؔ
میری بچی بھی گھر نہیں آئی

احمد محمود

آپ اپنا ہی زیاں ہے اور میں ہوں
ایک شہر خوش گماں ہے اور میں ہوں

بس خیال رفتگاں ہے اور میں ہوں
یاد کا کوہ گراں ہے اور میں ہوں

آج اس کی خوش خرامی یاد آئی
موج میں آب رواں ہے اور میں ہوں

کیا کہوں مصروفیت اس زندگی کی
ایک خواب رائیگاں ہے اور میں ہوں

بارشوں کے حق میں احمدؔ کیا کہوں میں
ایک خستہ سا مکاں ہے اور میں ہوں

غزلیں

روز کہے یہ دل
ان سے جا کے مل

چھوڑا ساگر بیچ
لہر بنی قاتل

رونے لگا ملاح
دور ہوا ساحل

کہاں گئے رستے
کہاں گئی منزل

ہجر ضروری تھا
عشق ہوا کامل

سب کچھ خاک ہوا
کچھ نہ ہوا حاصل

مجھے اب ان سے دوری ہے ضروری
کہاں تک جی حضوری ہے ضروری

حسیں ہے اس لیے اس کو یہ حق ہے
ادائیں ہوں غروری ہے ضروری

میں سب اپنوں سے پہلے جان دے دوں
یہی خواہش ہو پوری ہے ضروری

تمہیں پا لوں زمانہ جیت لوں میں
ضروری ہے ضروری ہے ضروری

شفقت حسین

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم تجھ سے نئی دوری کا غم پائیں گے ہم
حادثوں کی سیڑھیاں چڑھتے چلے جائیں گے ہم

غزل

یہ زندگی کچھ خواب دکھاتی رہی تا دیر
امید کی اک شمع جلاتی رہی تا دیر

میں چاک پہ اک عمر تلک بکھری خاکی
تکمیل کی حسرت میں گھماتی رہی تا دیر

کچھ ایسے مرا شعر سجا ان کے لبوں پر
خوشبو مجھے الفاظ سے آتی رہی تا دیر

ظاہر کیا اس پر کہ اسے بھول گئی ہوں
چپ چاپ مگر اشک بہاتی رہی تا دیر

کچھ یوں بھی مفر آپ کی یادوں سے نہیں تھا
تعبیر کی حسرت بھی جگاتی رہی تا دیر

وہ سو گیا آواز لگا کر مجھے لیکن
میں جاگتی اور خواب سجاتی رہی تا دیر

اک آس بہر طور بندھاتی رہی ڈھارس
مرہم مرے زخموں پہ لگاتی رہی تا دیر

مایوس مجھے کرتی تھیں ہاتھوں کی لکیریں
تقدیر کا لکھا میں مٹاتی رہی تا دیر

معلوم تو تھا بہروں کی بستی ہے یہ ساری
آواز بہر حال لگاتی رہی تا دیر

نم دیدہ مجھے دیکھ کے بے قابو ہوا وہ
اب دکھ ہے کہ میں اس کو رلاتی رہی تا دیر

عنبرین خان

غزل

سپاٹ چہرہ ہے، آنکھوں میں خواب تک بھی نہیں
بچھڑ رہے ہیں مگر اضطراب تک بھی نہیں

ترا خیال تو پھر بھی وجود رکھتا ہے
میں ایسا دشت ہوں جس میں سراب تک بھی نہیں

وہ چاہتا ہے کہ تحفے میں باغ دوں اس کو
مری رسائی تو شاخِ گلاب تک بھی نہیں

یقین جان یہ دیمک زدہ معاشرہ ہے
کسی کے گھر میں مقدس کتاب تک بھی نہیں

یہ کہکشائیں کسی اور شخص کی ہوں گی
ہمارے پاس تو اک آفتاب تک بھی نہیں

ہمارے اجڑے ہوئے دل کا حال مت پوچھو
وہ مے کدہ ہے کہ جس میں شراب تک بھی نہیں

میں جاں پہ کھیل کے دشمن کی جاں بچا رہا ہوں
یہ ایسی نیکی ہے جس کا ثواب تک بھی نہیں

رقیب کے لیے حاضر ہیں جسم و جاں گوتم
مرے لیے دلِ خانہ خراب تک بھی نہیں؟

گوتم ملتانی

غزلیں

گر بھلا بھی کہیں گلاس بھرا
دیکھتا رہ گیا میں پیاس بھرا

کس نے کرنا ہے واپسی کا سفر
راستہ چل رہا ہوں گھاس بھرا

سونی سونی سی ہے ہر ایک گلی
شہر کا شہر ہے ہراس بھرا

آرزو کا چمن کھلا نہ کبھی
درد کا کھیت ہے اُگاس بھرا

آ رہی ہے کچھ اجنبی سی مہک
نئی خوشبو سے ہے لباس بھرا

دل میں احساس نام کا بھی نہیں
جسم کا کیا بھلے ہے ماس بھرا

بھر گیا زہر زندگی میں امرؔ
آدمی شہد سی مٹھاس بھرا

امر مہکی

یوں ہی ڈھلتی ہوئی جوانی ہے
"رائیگانی سی رائیگانی ہے"

کوئی راجا نہیں کہ جو چاہے
زندگی اک اُداس رانی ہے

جتنا پیتا ہوں پیاس بڑھتی ہے
تیرے گھر کا عجیب پانی ہے

کیا ترا حُسن، کیا مری چاہت
میں بھی فانی ہوں تُو بھی فانی ہے

کیا یہاں کوئی شے نمو پائے
کھاری مٹی ہے کھاری پانی ہے

جانتا ہوں چمک سرابوں کی
میں نے صحرا کی خاک چھانی ہے

سبھی کردار منفرد ہیں امرؔ
ہر کسی کی عجب کہانی ہے

غزل

تم نے سمجھا کہ عارضی دکھ ہے
اے مسیحا یہ دائمی دکھ ہے

پھر کہیں جا کے عکس بنتا ہے
آنکھ پہلے تو مانگتی دکھ ہے

فیس بک ہی سے جی کو بہلاؤ
دیکھو لڑکی ، یہ شاعری دکھ ہے

ڈائری میں جو بین کرتا ہے
خط نہیں بلکہ کاغذی دکھ ہے

زندگی تھی ہمارا پہلا دکھ!!
سانس جو ہے، وہ آخری دکھ ہے

اک بھکارن کی گود میں بچہ!!
بھوک جس کا کہ مادری دکھ ہے

عشق بابرؔ ہے آگ کی صورت
ایسا دکھ ہے جو آتشی دکھ ہے

احمد سجاد بابر

غزلیں

اخلاق اکرم

متاعِ ہستی کے جائزوں میں رفاقتوں کا حساب کیسا
کہ بزمِ دل کے مباحثوں میں سوال کیسے، جواب کیسا

نہ راز پنہاں ہے دل میں کوئی، نہ حسرتوں کی مداشتیں ہیں
دیارِ وحشت کی خلوتوں میں لحاظ کیسے، حجاب کیسا

ہزار آنسو نہ دھو سکے جو وہ گرد کیسی تھی آرزو کی
نظر سے اوجھل نہ ہو سکا جو وہ خواہشوں کا سراب کیسا

کہیں مہکتی وفا کی باتیں، کہیں پہ لرزاں جفا کے قصے
کتابِ الفت کی رمز کیسی، محبتوں کا نصاب کیسا

کبھی امیدِ وصالِ یاراں، کبھی سکوتِ فراقِ ہجراں
اسی تذبذب میں زندگی ہے کہ جھیلنا ہے عذاب کیسا

ستم تو یہ ہے کہ جن کے ہاتھوں ہوا ہے اس دل کا حال ابتر
وہ ہم سے اخلاقؔ پوچھتے ہیں کہ حالِ دل ہے جناب کیسا

اسد رضا سحر

ہجر کیسے نہ کٹے گا ترا آسانی سے
اشک آنکھوں سے نکلتے ہیں فراوانی سے

اس محلے میں ہمیشہ ہی الٹ ہوتا ہے
آگ لگتی ہے تو لگتی ہے یہاں پانی سے

کیسی پھوٹی ہے وبا شہر میں سناٹا ہے
خوف آتا ہے مجھے شہر کی ویرانی سے

جتنے رہتے ہے اداسی مری بڑھ جاتی تھی
حل نکلتا تھا مسائل کا پریشانی سے

سرخرو ہو کے پلٹتا ہوں میں جب مقتل سے
مجھ کو تکتے ہیں مخالف مرے حیرانی سے

یہ فقط بات نہیں ہے یہ حقیقت ہے سحرؔ
خوب ڈرتے ہیں عدو قوتِ ایمانی سے

غزلیں

سونے والوں کو حقیقت میں جگائیں دونوں
خواب کے بام پہ اک دیپ جلائیں دونوں

ہم بچھڑ کر بھی کہانی میں کہیں زندہ رہیں
رونے والوں کو ذرا اور رلائیں دونوں

ایسا کرتے ہیں پرندے بھی ہوں خوش بوڑھے بھی
گاؤں کے چوک میں اک پیڑ لگائیں دونوں

تھک گیا چاند تو سورج نے یہ سرگوشی کی
وقت سے پہلے میاں، دن نہ چڑھائیں دونوں

ایک دوجے سے جدا رکھنا ہے ان کو لیکن
یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں مر ہی نہ جائیں دونوں

گھر کے دروازے پہ ماں، نہر کنارے والد
شہر جاتا تھا تو لیتے تھے بلائیں دونوں

ہم نے رسوائی سہی ہجر گزارا رو کر
یعنی اک عشق میں کاٹی ہیں سزائیں دونوں

محمد دانش رضا

رات باقی ہے کون آئے گا
آ کے در تیرا کھٹکھٹائے گا

بو دیے بیج ہم نے چاہت کے
جا بجا پیار لہلہائے گا

روٹھنا تو تمہاری عادت ہے
کون آ کر تمہیں منائے گا

آج مہماں بنیں گے ہم اُن کے
جو ہمیں پیار سے بلائے گا

تیرے کوچے میں کیوں کھڑا ہے نبیلؔ
انگلیاں ہر کوئی اُٹھائے گا

نبیل قیصر

مرزا غالب کی شاعری اور نثر کے خصائص

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزاری، کسی کی بازپرس سے بے نیاز وہ کیا جو دل میں آیا، شراب پینے میں اور آم کھانے میں انھیں وہ شہرت ملی کہ باید و شاید اسی طرح نثر اور نظم میں باکمال ٹھہرے کہ ناقدین کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ دونوں میں ان کی مثال مشکل سے ملے گی، یہ فیصلہ کرنا محال ہے کہ مرزا غالب بڑے نثّار ہیں یا بڑے شاعر ہیں۔ ان کے سوا کسی اور کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکا، ان کا شعری سرمایہ جتنا ثروتمند ہے اتنا ہی نثری کارنامہ اعلیٰ و ارفع ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ غالب کی زندگی میں قدر افزائی نہ ہوئی کہ انھیں بڑا شاعر یا بڑا نثر نگار ہی تسلیم کیا جاتا البتہ ان کے انتقال کے بعد غالب شناسی کے لیے فضا ہموار ہوئی اور وقت گزرنے پر غالب کو وہ مقام ملا کہ وہ بیک وقت اعلیٰ پائے کے نثّار اور شاعر کہلائے اب ہر صدی غالب کی عظمت کا اعتراف کرے گی، غالب یہ حسرت لے کر دنیا سے رخصت ہوئے کہ زندگی میں قدرے آسائش یا آسودگی نصیب ہوتی اور ہم عصر ان کی قدر و منزلت کا اعتراف کرتے، وہ اپنے طور پر دل کو تسلی دیتے ہیں کہ:

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

مرزا غالب بہت باخبر اور زیرک انسان تھے، وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ شہرت کی مثال اُبھرتے ہوئے آفتاب عالم تاب کی سی ہے کہ طلوع ہونے کے بعد وہ نصف النہار تک پہنچتا ہے، مگر کچھ دیر کے بعد زوال پذیر ہونا اور پھر غروب ہونا اس کا مقدر بن جاتا ہے، حقیقی ناموری پلک جھپکتے نہیں ملتی البتہ سستی شہرت آسانی سے مل جاتی ہے ایسے فنکار گزشتہ شاعروں کے خیالات

حسن عسکری کاظمی

اپنے الفاظ میں بیان کر کے دیکھتے ہیں ان کی مثال چبائے ہوئے نوالے چبانے والوں کی سی ہے، ان کے برعکس تخلیقی انداز اظہار، اچھوتے خیالات اور ذاتی تجربات اپنے الفاظ، اپنی تراکیب اور اپنے محرکات اپنا کر جو شاعر غزل یا نظم پیش کرتا ہے اسے عام قاری پڑھتے ہوئے غور وفکر کرتا ہے اور بات سمجھ میں آئے تو لطف اُٹھاتا ہے اور اس کی تہ تک رسائی پا کر مطمئن ہو جاتا ہے اور شعر اس کی رگ وپے میں اُتر جاتا ہے، مرزا غالب کے زمانے میں ذوق کو شہرت ملی مگر آج انھیں صرف زبان و بیان کی حد تک قبولیت حاصل ہے جب کہ مرزا غالب کی مقبولیت کا گراف بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے، ان کے قدر دان ہر جگہ پائے جاتے ہیں، ان کے اشعار میں انسانی نفسیات اور معاملات زندگی کی ابدی سچائی ایسا وصف ہے جو غالب کے سوا کسی دوسرے شاعر کے ہاں کم ہی نظر آیا۔

مرزا غالب مشکل پسند فلسفی شاعر ہونے کے سبب یہ ضروری سمجھتے تھے کہ ان کے شعر عام فہم نہیں اس لیے انھوں نے اپنے خطوط میں ایسے اشعار کی شرح بھی لکھ کر دوسروں کے لیے آسانی پیدا کی ورنہ اس نوع کے اشعار لوگوں کے سروں پر سے گزر جاتے اور غالب کو مہمل گو شاعر ہونے کا طعنہ سننا پڑتا۔

وہ کسی سے ستائش کے آرزو مند نہیں تھے البتہ انھیں ذہنی اذیت اُٹھانا پڑی اور ناقدری سے جھنجلاہٹ میں یہ کہا کہ میرے اشعار میں معنی نہیں تو نہ سہی۔

عہد موجود میں نامور نقاد اور محقق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مرزا غالب کے اشعار پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”غالب کا کلام جام جہاں نما ہے، غالب کے اشعار میں نہایت دقیق، دور رس اور پیچ در پیچ معانی کی ایک حیرت نگر اور عمیق دنیا آباد ملتی ہے“ مولانا الطاف حسین حالی نے یادگار غالب میں جو عالمانہ گفتگو کی اسی کی بنیاد پر غالب سے متعلق اب تک جو کچھ لکھا گیا اس کے ڈانڈے یادگار غالب سے جا ملتے ہیں۔

غالب کی غزل میں اپنے عہد سے آگے کی فکر غالب ہے جسے اس کے عہد میں چیستان تصور کیا ہے مگر غالب نے نکتہ چیں لوگوں میں رہ کر آنے والے زمانوں سے مکالمہ کیا ہے، آج اور آئندہ زمانے میں غالب کے پرستاروں میں برابر اضافہ ہوتا نظر آ رہا ہے۔ دیکھا جائے کہ وہ جس گلشن نا آفریدہ کا ذکر کرتے وہ آج کا زمانہ ہے، آج غالب شناسی کے حوالے سے جتنی تحقیق ہو رہی ہے پہلے زمانے میں ایسا نہیں تھا، غالب فکر و نظر کی آزادی پر پہرہ بٹھانے کے خلاف تھے، مگر وہ اپنے عہد کے رہن سہن، طور

طریقوں، دوست نوازیوں اور جمالیاتی قدروں میں رچے بسے رہنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے باوصف غالب وسیع المشرب، کشادہ نظر اور انسان دوست ہونے کا عملی ثبوت فراہم کرتے ہیں:

بسکہ دشوار ہے ہر اک کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

.....

غالب بحیثیت شاعر جتنے بڑے ہیں اسی طرح بطور نثر نگار بھی غالب اپنے عہد سے بہت آگے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نثر میں وہ تمام خصائص موجود ہیں کہ انھیں جدید نثر کا بانی تسلیم کیا جا چکا ہے۔ خطوط غالب میں ان کی نثر سے متعلق ہمارے ناقدین کا خیال ہے کہ غالب نثر و نظم میں کسی کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے، ان کے خطوط میں جو زبان استعمال کی گئی وہ عام فہم، روزمرہ اور محاورہ کا لحاظ رکھنے سے زیادہ اپنی راہ الگ نکالنے کی دھن کا شاخسانہ ہے کہ بات بات میں شوخی اور ہر فقرے میں ظرافت پائی جاتی ہے۔ ان کے خطوط نے غالب کی سیرت کا ایک نیا باب کھولا، ان کے عہد کے رؤسا اور نوابین غالب کے قدردان ہونے کے سبب اکثر ان کی ضرورتیں پوری کرتے رہے۔

مرزا غالب کے مذہب سے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں۔ ''زیادہ تر ان کا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیرؑ کو وہ رسولؐ خدا کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے'' خطوط غالب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی کہ ان خطوط سے ان کی شخصیت، میلان طبع، نسل و نسب، خاندانی حالات، تعلیم و تربیت، علم و فضل، اخلاق و عادات، آلام و مصائب اور تشریحات و تصرفات غرض یہ کہ بہت سے ابواب حیات کھل جاتے ہیں۔ ان کے خطوط کی چار جلدیں مرتب ہوئیں جب کہ غالب نے کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی مگر نثر نگاری میں ان کا شہرہ مکاتیب کے سبب سے ہوا اور وہ جدید نثر کے بانی کہلائے۔ مرزا غالب نے ایک خط منشی نولکشور کو لکھا کہ

''میں نے فارسی میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن اب مجھ سے یہ مشقت نہیں ہوتی، میں نے آسان راستہ اختیار کر لیا ہے، جو بھی لکھنا ہو اردو میں لکھ لیتا ہوں، نہ تکلف آرائی نہ خود نمائی تحریر کو گفتگو بنا لیا ہے'' غالب نے دہلی کے شاہی مشاعروں کا حال بھی بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے، میر مہدی مجروح کو ایک شاہی شاعر سے کی روئیداد سناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''مرزا حاجی شہرت نے کم و بیش ستر شعر کی غزل پڑھی، میں اکتا کر بہانے سے بھاگ کھڑا ہوا، اس وقت تک شہر کی دکانیں کھلی تھیں، چراغ روشن تھے،

ابھی آدھی رات نہیں گزری تھی، میں گھر آکر دیر تک اپنی اکتاہٹ شراب میں ڈبوتا رہا"

مرزا غالب نے شاعری اور نثر دونوں میں اظہار کا ایسا قرینہ اختیار کیا کہ ہمعصر فنکار اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ پائے، آج بھی غالب کا ہم قامت ڈھونڈے سے نہیں ملے گا مرزا غالب کی شہرت وقت گزرنے پر پھیلتی اور بڑھتی گئی اور اب دنیا کی مختلف زبانوں میں غالب پر تحقیق ہو رہی ہے، ان کی شاعری کو مختلف زاویہ ہائے نظر سے پرکھا جا رہا ہے کہ وہ کیا خصائص ہیں جن کی بنا پر ان کے خیالات اور اظہار کے انداز میں وہی تر و تازگی، وہی اچھوتا پن اور وہی استعجاب پایا جاتا ہے، انسانی فطرت کی ہمہ گیریت اور جذبوں کی صداقت کا احوال جس طرح غالب پر عیاں ہوا اسے قدرت کی فیاضی سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ غالب نے جو کہا وہ حرف آخر ہے لیکن اختلاف رائے کا حق اپنی جگہ مسلّم ہے چنانچہ غالب کا یہ خیال کہ "ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد" فنی حیات کا نمائندہ خیال ہے جب کہ اس نظریے کو رد کرنے کے حق میں دلائل موجود ہیں اور ہمارے قومی شاعر علامہ اقبال نے اثبات حیات کا نظریہ پیش کیا۔ اس بحث میں دونوں طرف سے باتیں ہوئیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا ہونا بے مقصد نہیں، اگر مقصد میں یقین ہے تو زندگی کا اعتبار قائم ہے۔ مرزا غالب کا پُر آشوب زمانہ حساس طبائع کے لیے اذیت ناک ٹھہرا، یہی صورت احوال حافظ شیراز کو پیش آئی وہ بھی یہی کہہ کر رخصت ہوئے کہ

"آخرش منزل ما وادیٔ خاموشاں است"

موت ایک حقیقت سہی مگر زندگی کا ذائقہ ہمارے قیام کا جواز فراہم کرتا ہے، یہ بھی درست ہے کہ "موت اک چبھتا ہوا کانٹا دل انسان میں ہے" اور یہ بات بھی علامہ اقبال نے کہی، اس گفتگو کا مقصود یہی ہے کہ مرزا غالب وہ زندہ دل آدمی ہے جو زندگی کا رس نچوڑنے کے حق میں ہیں، قویٰ مضمحل ہو جائیں پھر بھی زندگی سے جُڑے رہنے کی تمنا سے دست کش نہ ہونا۔ ان کی زندہ دلی کا ثبوت ہے:

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

.....

اور یوں مرزا غالب ہزار دکھ کو سہہ کر بھی شاعری اور نثر دونوں میں "مردِ ظریف" کا کردار ادا کرتے رہے اور حالی جیسے وضع دار، شریف النفس اور دین دار ان کے قصیدہ خواں بنے رہے۔

☆☆☆☆☆

مجید امجد: نئے تعینات

مجھے ڈاکٹر محمد افتخار شفیع صاحب سے ایک تعلق خاطر محسوس ہوتا ہے کیوں کہ وہ آج میری مادر علمی گورنمنٹ کالج ساہیوال کے ان در و بام میں مصروف تدریس ہیں، جہاں میں کبھی اپنے اساتذہ کے سامنے تحصیل علم کے لیے بیٹھا کرتا تھا۔ اور اب افتخار صاحب نے اس تعلق خاطر میں ایک اور جہت کا اضافہ کر دیا ہے۔ وہ یوں کہ انھوں نے میرے پسندیدہ شاعر مجید امجد کے حوالے سے ایک کتاب ترتیب دی ہے اور مجھے اس کے بارے میں یہ چند معروضات پیش کرنے کا اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔ ہم بی۔اے میں پڑھتے تھے کہ مجید امجد کا اولین شعری مجموعہ شب رفتہ شائع ہو کر آیا، تب سے لے کر اب تک اس انوکھی شاعری سے دلی لگاؤ میں کمی نہیں آئی۔ ہم مجید امجد کو بائیسکل پر سوار شہر کی سڑکوں پر آہستہ آہستہ آتے جاتے دیکھا کرتے تھے۔ ان کے کمال فن کا جادو

خورشید رضوی

ہم پر تو اسی زمانے سے منکشف ہو گیا تھا مگر ساہیوال سے باہر کے ادبی حلقوں میں ابھی ان کا تعارف کم کم تھا۔ ان کے فن پر کسی نے کچھ لکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اس سلسلے کا پہلا قابل ذکر مضمون شاید ڈاکٹر وزیر آغا کا تھا۔ بعد میں بھی کافی مدت تک معدودے چند کے سوا معروف نقادوں کی توجہ اس منفرد شاعر کی طرف مبذول نہ ہو سکی۔ الحمد للہ کہ اب کچھ عرصے سے مجید امجد کا اعتراف عام ہو چکا ہے اور برصغیر کے اکثر ممتاز ناقدین انھیں اقبال کے بعد آنے والے ممتاز ترین شعرا کی صف میں نمایاں مقام دیتے ہیں۔ اس بڑھتے ہوئے اعتراف کے نتیجے میں 'فطری طور پر' مجید امجد کے فن اور شخصیت پر تصنیفات کا سلسلہ بھی روز افزوں ہے۔

برادرم افتخار شفیع صاحب کی تازہ تصنیف مجید امجد: نئے تعینات اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جس میں انھوں نے اس موضوع پر کچھ نئے زاویوں سے نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ پہلا مضمون مجید امجد کی ایک نایاب نعت نہ صرف اس فن پارے کے متن کو متعارف کرواتا ہے (جس کی بازیافت کا سہرا خود افتخار شفیع کے بہ قول ڈاکٹر اسلم ضیا صاحب کے سر ہے) بلکہ عمومی اعتبار سے مجید امجد کے مذہبی رجحانات، فن نعت کے بارے میں ان کے نقطہ نظر اور اس ماحول پر بھی روشنی ڈالتا ہے جس میں مجید امجد کے دینی میلانات کو فروغ ملا۔

دوسرا مضمون فسانہ آدم علم فلکیات پر مقالہ یا ترجمہ مجید امجد کے ایک پسندیدہ موضوع مطالعہ یعنی علم فلکیات پر ان کے ایک نامکمل مسودے کا تجزیہ ہے۔ افتخار شفیع صاحب کے مطابق کہ یہ کوئی طبع زاد مضمون یا مقالہ نہیں بلکہ Martin Davidson کی کتاب An easy outline of Arstronomy کا ایک ادھورا ترجمہ ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں ڈیوڈسن کی کتاب اور اس مسودے کے بعض اقتباسات کا موازنہ بھی پیش کیا ہے۔ تاہم عنوان فسانہ آدم اس مفروضے کے بارے میں خلجان پیدا کرتا ہے۔ اگر مجید امجد کے پیش نظر ڈیوڈسن کی کتاب کا ترجمہ ہی تھا تو فسانہ آدم کا عنوان کچھ برمحل معلوم نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں تو اسے رہنمائے فلکیات قسم کے عنوان سے معنون

ہونا چاہیے تھا۔ خود افتخار شفیع نے بھی مضمون کے آخر پر قطعیت سے دامن بچاتے ہوئے اس بحث کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔ شاید مجید امجد فلکیات کے جدید آفاق کے پس منظر میں اجرام فلکی سے متعلق انسانی تصورات کے دور بہ دور ارتقا کا جائزہ بھی لینا چاہتے تھے اور انھوں نے اسی مناسبت سے فسانہ آدم کا عنوان منتخب کیا مگر یہ منصوبہ روبہ عمل نہ آسکا۔ پاک وہند جنگی آویزش سے مربوط کچھ نظمیں جو کسی ترانہ گوئی سے بڑھ کر اس تجربے سے مجید امجد کی گہری اثر پذیری، وطن سے غیر معمولی محبت نیز جنگ، اس کی نفسیات اور اس کے ساتھ آنے والے مسائل کی نہایت باریک تہوں کی عکاس ہیں ایک اور مضمون میں زیر بحث آئی ہیں۔ سہرے اور اسی قسم کی دیگر تہنیتی نظمیں ایک مخصوص اور محدود محفل کے لیے ہوتی ہیں لیکن اہم شعرا کے قلم سے نکلی ہوئی اس نوعیت منظومات بھی ایک خاص زاویے سے اہمیت کی حامل ہوتی ہیں، مضمون مجید امجد تقریب شادی میں ان کے ایسے ہی اشعار سے متعلق ہے، جو بعض احباب کی خوشی میں شرکت کے لیے لکھے گئے۔

مجید امجد کی شناخت تو ان کی شاعری ہی ہے لیکن عروج سے وابستگی کے زمانے میں انھوں نے نثر نگاری کی بھی خاصی مشق بہم پہنچائی چناں چہ ان کے قلم سے دیباچوں، تقریظوں، یادوں، کالموں، اداریوں، ترجموں اور بچوں کے ادب کی صورت میں بہت سے نثر پارے بھی یادگار ہیں۔ افتخار صاحب کو اس سرمایہ نثری سے بھی خاصا شغف رہا ہے، جس کا ثمر ان کا مرتب کردہ کلیات نثر مجید امجد ہے۔ زیر نظر کتاب میں بھی ایک مضمون مجید امجد کی نثر کے تعارف، جائزے اور تجزیے پر مشتمل ہے جب کہ آخری مضمون مجید امجد کی ذاتی اور تخلیقی تنہائی پر گہری نظر ڈالتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مجموعی اعتبار سے افتخار شفیع صاحب کی یہ کاوش امجد شناسی کے ایوان میں تازہ مباحث کا دروازہ کھولنے میں کامیاب رہی ہے اور اپنے موضوع پر ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ میں مجید امجد: نئے تعینات کا خیر مقدم کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

اقبال فطرت اور سماج

محمد رفیق خان

دریں چہ شک کہ شاعر مشرق علامہ اقبال (مرحوم) کو ارضی سطح پر مصورِ فطرت گردانا گیا ہے۔ ویسے تو ایک نہیں بہت سے اور فلاسفہ جن کا تعلق مشرق اور مغرب دونوں سے ہے نے فطرت کو اپنے نظریات کا بنیادی حوالہ منتخب کیا ہے۔ مغربی دنیا سے جن فلاسفہ کے نام لیے جا سکتے ہیں اُن میں زیادہ تر سیاسی سائنسدان ہیں مثلاً ہابس، لاک، روسو، ہیگل، کارل مارکس اور بہت سے دوسرے جب کہ مشرق سے برصغیر ہندوستان کے رابندر ناتھ ٹیگور، جوش ملیح آبادی، علامہ اقبال اور فیض احمد فیض کے اسماء گرامی ذہن میں آتے ہیں ان تمام فلاسفروں نے اپنے فکر اور نظریات کی بنیاد فطرت اور انسان کے درمیان عمل اور ردِعمل پر رکھی۔ بالفاظ دیگر مذکورہ بالا فلاسفروں اور فلاسفر شعرا کا فلسفہ اور شاعری فطرت سے ماخوذ ہے۔

فطرت: موضوع کے حوالے سے جو پہلا سوال راقم الحروف کے ذہن میں اُبھرتا ہے وہ یہ ہے کہ فطرت کیا ہے؟ فطرت کی اصطلاحی تعریف کے بہت سے مکاتیب فکر سرچشمے ہیں لیکن ہم مناسب سمجھیں گے کہ فطرت کی اصطلاحی تعریفوں میں سے دو اصطلاحات تک محدود رہیں:

(۱) کائنات میں موجود ربِ کریم کی ہر تخلیق کو دیگر موجودات سے الگ نہیں گردانا گیا، بلکہ ہر شے تخلیقِ قدرت ہے، جس میں انسان بھی شامل ہے۔

(۲) کائنات اور انسان دو الگ الگ تخلیقات ہیں۔ علامہ اقبال نے (ب) کو اپنایا اور اختیار پر پہنچ کر نظریہ توحید کے توسط سے دونوں کو یکجا کر دیا۔ یہاں تک کہ زندگی کو بھی ایک لامحدود حرکت گردانا، جس کا کوئی کنارہ نہیں جیسا کہ وہ فرماتے ہیں کہ اسے امروز فردا کے پیمانے سے نہیں ماپا جا سکتا:

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ماپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

....

علامہ اقبال کو ایک پختہ ذہن کے مالک مفکر تھے۔ ان کی مسلسل کشمکش اور حکمتِ عملی کا انجام منزلِ آزادی تھی۔ انھوں نے اپنے فلسفے کو بحیثیت ایک اینٹ پر اینٹ رکھ کر عمارت تعمیر کرنے والے معمار کی طرح اپنا کردار ادا کیا اور یہ کردار معلمانہ تھا۔ معلم کے مطمعِ نظر میں مقاصد، تعمیر، انفرادیت، ہندوستان کی برطانوی استعمار سے آزادی مع مسلمانانِ ہند کی خوشحالی، تعمیرِ ملتِ اسلامیہ، حصولِ آفاقی (Universal Order) تھے جب کہ انتہائی مقصدِ اعلیٰ "حصولِ توحید" تھا۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ انھوں نے ان مقاصد کے حصول کے لیے بطور معلم کیا طریقِ کار اختیار کیا۔

مشاہداتِ فطرت: موضوع کے حوالے سے علامہ اقبال کا جو اہم ترین درسِ اول تھا، وہ یہ تھا کہ حضرت انسان کو کائنات میں اس لیے اتارا گیا ہے کہ وہ جو کچھ دیکھے، سنے اور جو کچھ اس کی راہ میں آئے اس کا گہرائی میں مطالعہ کرے۔ اُن کا یہ درس قرآن پاک سے ماخوذ ہے۔ مثال کے طور پر قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ:

ترجمہ: کیا تم اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے پیدا کیا گیا اور پہاڑوں کی طرف کہ انھیں کیسے گاڑا گیا اور زمین کی طرف کہ اسے کیسے ہموار کیا گیا۔

اس اسلوب کو اپناتے ہوئے علامہ اقبال (مرحوم) نے جو درس دیا وہ لاتعداد اشعار میں موجود ہے۔ یہاں ہم معدودے چند قلمبند کر رہے ہیں: وہ بانگِ درا کی ایک غزل میں یوں رقم طراز ہیں:

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگزر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ

....

اسی طرح بالِ جبریل کی نظم "جاوید کے نام" میں فرمایا:

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گُل سے کلام پیدا کر

ان اشعار کی گہرائی میں اگر اترا جائے تو یقیناً نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ:

"کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے، وہی خدا ہے۔"

جیسا کہ انھوں نے خود فرمایا ہے کہ:

گل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود

لہٰذا ہم علامہ اقبال کے درسِ اول کا اختتام اس بات پر کرتے ہیں کہ جس طرح سائنس کا ارتقا صرف تین الفاظ کے مجموعے پر مبنی یعنی "تجربہ، مشاہدہ اور نتیجہ"۔ ہم نے یہ تینوں ستون لگا دیے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے تھا کہ وہ حصولِ مقاصد کے لیے فطرت کی گہرائی میں مطالعہ کرے تا کہ اس کا اجتماعی مطمعِ نظر تک کا سفر آسان ہو جائے۔

فطرت اور انسان کے درمیان عمل اور ردعمل:

جب انسان کو فطرت کے اندر یا سامنے لا کھڑا کیا گیا تو ظاہر ہے کہ دونوں کے درمیان عمل اور ردعمل لازم تھا، لہٰذا انسان چونکہ مختلف احواس سے لیس تھا لہٰذا اس نے فطرت پر تجربہ، مشاہدہ اور نتیجہ کا عمل شروع کر دیا۔ مشاہدات نے اسے آگاہ کیا کہ فطرت تو ایک ناہموار، بے ترتیب، بھدی اور بالوصف یکسانیت چیز ہے جو اس کے جمالیاتی ذوق کی تسکین نہیں کر سکتی۔ لہٰذا انسان نے ٹھان لی کہ اس نے فطرت کو اپنے مزاج اور اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تبدیل کرنا ہے۔ یہ کوئی بازیچۂ اطفال نہیں تھا بلکہ ہزاروں سال پر محیط جان جوکھوں کا کھیل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فطرت اور انسان کے درمیان عمل اور ردعمل کے بارے میں علامہ اقبال نے یہ اشعار کہے:

ہزاراں سال با فطرت نشستم
بہ او پیوستم و از خود گسستم
ولیکن سرگذشتم ایں دو حرف است
تراشیدم، پرستیدم، شکستم

ترجمہ: "میں ہزاروں سال فطرت کے ساتھ بیٹھا اس کے ساتھ پیوست ہوا اور خود سے گزر گیا۔ لیکن اس کی کہانی ان دو حرفوں میں ہے کہ میں نے اسے تراشا، اس کی پرستش کی اور اسے توڑا۔"

لہٰذا انسان کا جب فطرت کے ساتھ آمنا سامنا ہوا تو فطرت سے یوں مخاطب ہوا:

طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

ترجمہ: "کوئی نئی طرح ڈال کہ ہم جدت پسند واقع ہوئے ہیں۔ یہ تم نے آج اور کل کا کیا حیرت خانہ بنا رکھا ہے؟"

اب تک بحث و تحقیق سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کی اپنی بھی تو ایک فطرت ہے، جس کے اندر لاتعداد صلاحیتیں خالقِ اولیٰ کی طرف سے ودیعت ہیں۔ انسان نے ثابت کر دیا ہے کہ:

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں
ہم بھی کبھی یہ کہہ کر فخر کرنے لگتے ہیں کہ
حسن و جمال سے ہے میرا فن تمام

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا، وہ تو کر!

لہٰذا جب تخلیق آدم کی گئی تو کیا ہوا؟

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

....

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام صفات الٰہیہ ودیعت کر کے اس کائنات میں اپنا نائب بنا کر اتار دیا۔ اس میں تمام صلاحیتیں آ گئیں جن سے وہ تسخیرِ فطرت کر سکتا تھا۔

تسخیرِ فطرت: مذہب اسلام میں تسخیر فطرت کی انسانی صلاحیتوں کی بنیاد اس امر پر ہے کہ:

ترجمہ: "بیشک ہم نے انسان کو مشکلات کے لیے پیدا کیا۔"

یہی وجہ ہے کہ تسخیرِ فطرت کا راز اس میں ہے کہ زندگی ایک حرکت ہے جسے سکون سے نہیں سمجھا جا سکتا۔

دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہترین سانچے میں ڈھالا ہے اور اسے صفاتِ الٰہیہ سے نوازا ہے۔ سورۃ طین میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

ترجمہ: انسان کی اس صورت گری و صفاتِ الٰہیہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسے کائنات میں اپنا نائب / خلیفہ مقرر کیا ہے۔

جب انسان اپنے مقاصد کے حصول کا ارادہ کرے تو سب سے پہلے اُسے اپنے اندر کی دنیا کا سفر کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنی ان صلاحیتوں کا تخمینہ لگا سکے جو حصول مقاصد کے لیے درکار ہوں۔ علامہ اقبال کی نصیحت اس ضمن میں یہ ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی تلاش کرے اور اپنی صلاحیتوں کا اندازہ لگائے:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

....

یہی صلاحیتیں ہیں جن کے تحت انسان آج کل ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے، ہوا میں پرواز کر رہا ہے۔ اور راکٹ کے ذریعے دوسری دنیاؤں کی تلاش کر رہا ہے۔ یہی راہ علامہ اقبال نے مسلمانانِ عالم کو دکھانے کی بھرپور کوشش کی اور کسی حد تک خاصے کامیاب بھی رہے۔ اب یہ عالم ہے کہ:

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

....

بات یہیں ختم نہیں ہوتی انسان میں صلاحیت موجود ہے کہ عقل کے ذریعے کچھ منازل طے کرے جہاں تک عقل مشعل راہ ہو سکتی ہے۔ بعد ازاں وہ عشق اور وجدان کے ذریعے بذریعہ عقلِ سلیم مقصد اولیٰ یعنی قربِ الٰہی تک حاصل کر سکتا ہے یہاں تک کہ اپنی ذات کو

خالق کل کی ذات میں تحلیل کرکے تکمیل ذات کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "واقعہ معراج" کے بارے میں علامہ اقبال کچھ اس طرح سے بات کرتے ہیں کہ:

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

یہاں تک ہم اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ بشر اگر اپنی ذات کو ڈوب کر پہچان لے اور اپنی صلاحیتوں کا اندازہ لگالے تو وہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ وہ بڑے سے بڑا معرکہ سر کرلے۔ لہٰذا علامہ اقبال نے اس پیغام کے ساتھ ادب تخلیق کیا، جس کے دنیاوی مراحل میں مسلمانانِ ہند کی فلاح و بہبود، آزادی اور اُس وقت کے وطن ہندوستان کی آزادی شامل تھی جب کہ اصل منزل قربت الٰہی تھا۔ اب مرحلہ تھا کہ اس تخلیق کا اطلاق اپنی فکری اور سیاسی مہم پر کیسے کیا جائے۔ لہٰذا علامہ اقبال نے ایک فکری حکمت عمل تشکیل دیا تاکہ ان نظریات کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ سماج یعنی سوسائٹی کی مختلف سطحوں پر تربیت بطور معلم کی جائے۔ اس کے لیے انھوں نے سوسائٹی کو تین طبقات میں تقسیم کیا اور ہر سطح پر مناسب حکمت عملی وضع کی: یعنی بچے، نوجوان اور بوڑھے۔

انھوں نے بچوں کے لیے بڑے ہی دلکش انداز میں نظمیں لکھیں، جن میں بنیادی طور پر دعائیں اور قومی ترانے شامل تھے اور ان سے ہم سب لوگ واقف ہیں۔ مثلاً بچے کی دعا:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

ترانۂ ہندی:

چین و عرب ہمارا ، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم ، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

تاکہ ان میں جذبۂ حب الوطنی پیدا ہو اور وہ جوان ہونے کے بعد قوم ملک سلطنت کی بھاگ دوڑ سنبھالیں اور اپنے وطن کو آزاد کرانے کے قابل ہو جائیں۔ بعد ازاں ان کو چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھ کر اخلاقیات کا درس دیا۔ ان نظموں میں چند اہم مثالیں "ایک پہاڑ اور گلہری"، "ایک گائے اور بکری"، "ہمدردی" اور بہت سی۔ مقصد یہ تھا کہ یہاں انھیں طاقتور مردان آہن بننے کی تربیت دی جائے کہ وہاں اُن کی تربیت ایسی بھی ہو کہ وہ ایک دوسرے کو برداشت کرسکیں۔ ایک دوسرے کے کام آسکیں اور اپنے محسنین کو پہچان سکیں اور ان کے کام آسکیں۔ یوں کہیے کہ یہ اُن کی درسگاہ کا ابتدائی حصہ تھا۔ اگلی سطح پر انھوں نے نوجوانوں کے لیے نظمیں تحریر کیں۔ جن میں انھوں نے غیرت دلائی کچھ اپنی کہہ کر اور کچھ اپنے اسلاف کی بہادریوں کے قصے

سنا کر۔ ایک مثالی نظم جو نوجوانوں کے نام ہے کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تُو نے
وہ کیا گردوں تھا تُو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا، جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

.....

اسی طرح ایک نوجوان کو نصیحت کرتے ہیں:

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں، نہ استغنائے سلیمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

غلاموں کو انھوں نے اس طرح غیرت دلائی:

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو

.....

اسی طرح انھوں نے بیماروں اور بوڑھوں کے لیے اشعار کہے تاکہ انھیں آنے والی مصیبتوں سے روشناس کرایا جائے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

آزادی ہند اور شاعرِ مشرق: علامہ اقبال نے کھلم کھلا ہندوستان کی آزادی کی فکری جنگ لڑی۔ ہم مانتے ہیں کہ وہ ایک سرگرم عمل سیاست دان نہیں تھے نہ کبھی سڑک پر آئے اور نہ ہی کسی جلوس کی قیادت کی۔ البتہ انھوں نے لگاتار انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں آزادی سے متعلق ولولہ انگیز نظمیں پڑھیں، جن سے مسلمانانِ ہند کو؟؟؟ تقویت ملی ان کے ہمنواؤں میں رابندر ناتھ ٹیگور اور جوش ملیح آبادی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کو تو بعض ادبی انجمنوں نے شاعرِ انقلاب کے لقب سے بھی نوازا تھا لیکن ان کو وہ مقام نہ مل سکا جو علامہ اقبال خطۂ الٰہ آباد دے کر نصیب ہوا۔ قائداعظم کے ساتھ علامہ اقبال لگاتار رابطے میں رہے اور اُن کو اپنے خلوص پر مبنی رائے سے نوازتے رہے۔ انھیں دنوں کارل مارکس کا فلسفۂ اشتراکیت روس میں شدت سے مقبول ہو چکا تھا، یہاں تک کہ اُس کا اطلاق بھی ہو گیا جو ''انقلابِ روس'' کی صورت میں نمودار ہوا۔ علامہ اقبال اور قائداعظم دونوں ایک ہی سوچ کے مالک تھے کہ آزادی کی جنگ دستوری طریقے سے لڑی جائے اور وہ کامیاب رہے۔ انقلاب روس تو بعد ازاں ناکام ہو گیا لیکن علامہ اقبال پاکستانیوں اور مسلمانانِ اسلام کے دل میں گھر کر گئے وہ زندہ تھے، زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

☆☆☆☆☆

بارے "شاہ واستان" (قسط # 3)

میرے پہلے شعری مجموعے "اُڑانوں کا ہرا موسم" کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

حسنِ دریا کا اس کی روانی میں ہے
داستاں کا مزا خوش بیانی میں ہے

داستاں گو تب تک داستاں جاری رکھتا ہے جب تک ہنکارے کی آتی رہتی ہے۔

بارے "شاہ واستان" کی دوسری قسط سپردِ ای میل کرنے کے بعد گومگو میں تھا کہ آگے بڑھوں یا نہیں۔ پہلی قسط کے بارے میں کئی دوستوں کی رائے مثبت تھی مگر زندگی اگر مگر سے نہیں چلتی۔ تبھی نعمان منظور کا فون آ گیا۔ سماعت کی نارسائی کی وجہ سے آواز پہچان نہ پایا۔ کچھ تو یہ عمر کا تقاضا ہے اور کچھ رابطے بھی غیر محسوس طور پر سرد خانے کی نذر ہو جاتے ہیں۔ مہینوں کے بعد ملاقات ہو تو الزام موبائل فون پر آتا ہے...... موبائل گم ہو گیا تھا یا میموری سے نمبر ڈیلیٹ (Delete) ہو گئے تھے۔ تحمل سے بات کرنے کی گزارش کی جو مان لی گئی۔ سماعت مہربان ہوئی تو کھلا کہ نعمان منظور ہے۔ اس نے "شاہ واستان" کے بارے میری تحریر کا تذکرہ کیا اور میرا نمبر شوکت علی شاہ کو دینے کی اجازت طلب کی۔ "ابھی کچھ لوگ زندہ ہیں جہاں میں" ...... بے اختیار کسی کا یہ زندہ مصرع یاد آ گیا۔ تعجب ہوا کہ روایت پرست لوگ موجود ہیں۔ آج کل ایسا کم ہوتا ہے کہ یہ پوچھا جائے۔

"کیا میں آپ کا فون نمبر فلاں کو دے دوں؟"

اسلام عظمی

تہذیب بہر حال ایسا تقاضا کرتی ہے۔ اجازت دے دی تو کچھ بعد شوکت علی شاہ کا فون آ گیا۔ گویا مجھے بارے "شاہ داستان" بڑھانے کا اشارہ مل گیا۔ قافلہ بیاض نومبر ۲۰۱۵ کی طرف بڑھ گیا۔ "بیاض" کے شمارے ترتیب وار رکھتا ہوں۔ البتہ وہ شمارے جو دائیں بائیں ہو گئے یا کھو گئے استثنیٰ میں آتے ہیں۔

یہ شمارہ احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶-۲۰۱۶) کے بارے ہے۔ احمد ندیم قاسمی معدودے چند لوگوں میں سے ہیں۔ جنھوں نے اپنی زندگی ادب کے نام کر دی۔ کئی نسلیں اُن سے فیضیاب ہوئیں۔ اُنھوں نے اپنی شاعری اور نثر میں عام لوگوں کی نمائندگی کی۔ میں مضامین کے اپنے دوسرے مجموعے "ساختہ" میں لکھ چکا ہوں کہ قاسمی صاحب کے یہ شعر مجھے بہت ہانٹ کرتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے ہیں۔

جب انتظار حد سے گزرنے لگا ندیم
میں نے سنا سکوت کو بھی بولتے ہوئے
غمِ دوراں غمِ جاناں کی طرف یوں آیا
جانبِ شہر چلے دخترِ دہقاں جیسے

....

انسانی کرب کی اس سے زیادہ تصویر کشی اور کیا ہو گی۔ خالد احمد خوش قسمت تھا کہ اُس نے اپنی عمر کا غالب حصہ قاسمی صاحب کی صحبت میں گزارا۔ اُس نے اُنھیں یوں خراج پیش کیا۔

کس نے یہ راستے نکالے تھے
کس کے پاؤں میں کس کے چھالے تھے
دشت بولے اگر زبان ملے
کس نے کتنے علم اچھالے تھے

....

علم اُچھالنے والے علم اُچھالتے جاتے ہیں۔ لکھنے والے لکھتے جاتے ہیں۔ بہت کچھ حوادث کی نذر ہو جاتا ہے پھر بھی سے کی ریت پر بہت کچھ ایسا لکھا ہوتا ہے جسے وقت کی آندھی مٹا نہیں پاتی۔ ضمیر کی عدالت میں دیانت دار لکھاری جھوٹ نہیں بولتا۔ جھوٹ کا شرف شاید سیاست والوں کے حصے میں آیا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ادب کی دنیا میں کچھ بھی نیا نہیں بڑی حد تک درست ہے۔ ہر سچ اور ہر جملہ پہلے سے بولے گئے سچ یا پہلے سے بولے گئے جملے کا تسلسل ہے۔ بعض اوقات مگر سچ پر جھوٹ کی اتنی تہیں چڑھ جاتی ہیں کہ پیتل پر سونے کا گمان ہوتا ہے۔ تسلسل سے یاد آیا کہ "تسلسل" غلام محمد قاصر کے شعری مجموعے کا نام ہے۔ قاصر کیا خوبصورت شاعر تھا!

تم یوں ہی ناراض ہوئے ہو ورنہ مے خانے کا پتا
ہم نے ہر اُس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

....

یہ وہ دن تھے جب "مفتون" کا دفتر نئی انار کلی میں تھا۔ اس سے ذرا پرے احسان دانش کا چوبارہ تھا۔ "ناقابلِ فراموش" کے لکھنے والے دیوان سنگھ مفتون کے اخبار

''ریاست'' کا دفتر بھی دہلی شہر کے ایک کوٹھے پر تھا۔ سیڑھیوں کے دروازے کے ساتھ پان والے کی دُکان تھی۔ دہلی میں رہائش اختیار کرنے والا پان کھانا شروع کر دیتا ہے' خواہ وہ سکھ ہی کیوں نہ ہو۔ خوشونت سنگھ بھی ''دہلایا'' گیا۔ خیر بات ''ثنون'' کے دفتر اور غلام محمد قاصر کی ہو رہی تھی۔ دفتر کی کھڑکی مغرب کی جانب کھلتی تھی۔ گرمی کے موسم میں سورج نے دفتر کی کھڑکی سے جھانکا تو دھوپ کی زد میں آیا ہوا غلام محمد قاصر تیزی سے کھڑکی کی طرف لپکا۔ قاسمی صاحب بے ساختہ کہہ اُٹھے۔

''قاصر سورج کو کچھ نہ کہنا''۔

مارچ ۲۰۱۶ء کا بیاض کھولتا ہوں۔ شوکت علی شاہ کے کالج کے زمانے کا تذکرہ ہے۔ جوانی دیوانی نہ بھی ہو پھر بھی زبردست شے ہے۔ انسانوں اور بھیڑ کے بچے پر یکساں آتی ہے۔ یادیں پرانی شراب کی طرح ہیں۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے' یادوں کا نشہ دوآتشہ ہو جاتا ہے۔ شاہ بادشاہ کالج کے دنوں کی یاد میں رقم طراز ہیں۔

'' ہم سب عمر کے اُس حصّے میں تھے' جہاں بیٹھنے کے بجائے دوڑنے بھاگنے کو جی چاہتا ہے۔ جب خون رگوں میں اسپ تازی کی طرح دوڑ رہا ہو' سارے وجود میں پارہ سا تھرکتا محسوس ہو' بازو کی مچھلیاں ہر وقت پھڑپھڑاتی رہیں' مستی میں دیوار کو بھی ٹکر مارنے کو جی چاہے' جسم کے انگ انگ رُوں رُوں سے بے نام صدائیں سنائی دیں تو آرام کرنے یا ٹک کر بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔''

یہ تو ہوئی جوانی کی کہانی۔ جوانی کی کہانی ایک وہ ہوتی ہے جو لوگ ایک دوسرے کو بتاتے ہیں۔ دوسری کہانی کیفیات ہے۔ افسانے' ناول اور یادداشتیں انھی کیفیات کی یادداش ہیں۔ شاہ بادشاہ کے قلم کی شوخی دیکھیے۔

''وہ دل رُبا حسینہ ہمیں اپنی طرف بلا رہی تھی۔ ایک کھلا سندیسہ، ایک واضح پیغام، ایک لطیف اشارہ، ایک پُرلطف دعوت نظارہ۔ جی چاہا اُڑ کر اُس ساحرہ کے قریب پہنچ جائیں۔ اس سے گلے ملیں۔ میٹھی میٹھی باتیں کریں۔ اس کے لمس سے مشام جاں کو تروتازہ کریں۔ آخر وہ کون تھی؟

قصیدہ گوئی میں لفظ گریز خاصا مستعمل ہے۔ ''آخر وہ تھی کون!'' کا ذکر کرتے ہوئے نثر گوئی میں گریز کا پہلو دیکھیے۔

''حسین وادی حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ چار سُو گھنے درختوں نے چھتریاں سی تان رکھی تھیں۔ جنگلی پھولوں نے دھرتی کو قوس قزح کی چادر اوڑھا دی تھی۔ سبزے کے اس وسیع سمندر میں ساری وادی کشتی نوح کی طرح ڈولتی نظر آئی۔ دور دریا ایک دیو کی مانند مخالف سمت سے کف اُراتے' پھنکارتے' ایک دوسرے کو للکارتے پوری تندی' تیزی اور طیش کے عالم میں گتھم گتھا

ہو رہے تھے۔ ہم من مبارز کا وہ سماں دیدنی تھا۔ ان کی لن ترانیاں وادی میں گونج رہی تھیں۔ ایک اپنا شجرہ نسب کابل کے سلسلہ ہائے کوہ سے جوڑ رہا تھا تو دوسرا اپنے بزرگوار ہمالہ کی شان میں رجز خواں تھا۔

پروفیسر اشفاق علی خان کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے ”کہ روکنے سے پانی ضائع نہیں ہوتا بلکہ ریگولیٹ ہوتا ہے اور ہمارے لیے پانی کی وہی اہمیت ہے جو عربوں کے لیے تیل کی“۔ یہیں انھوں نے دریائے سندھ کے نام کے بارے بتایا کہ ”بین الاقوامی قانون کے مطابق دریاؤں کی پہچان اس کا ماخذ نہیں بلکہ اس کا رستہ ہے۔ اٹک کا پل دو صوبوں کو ملاتا ہے۔ یہاں سے چور بھی گزرتے ہیں اور سادھو بھی۔ قانونی گزرگاہ بھی ہے اور غیر قانونی بھی۔ ہندو بنیا چالاک ہے۔ اس نے ابھی سے ڈیم بنانے شروع کر دیے ہیں اور ہمارے حصے کے پانی پر بھی ہاتھ صاف کر جاتا ہے..... تقسیم کے وقت اُن کے حصے میں پنجاب کے گیارہ (۱۱) ضلعے آئے۔ ہمیں انیس (۱۹) ملے اب زرعی لحاظ سے وہ گیارہ ہم پر حاوی ہیں۔“

اٹک کا پل دو صوبوں کو ملاتا ہے۔ یہاں سے چور بھی گزرتے ہیں اور سادھو بھی۔ قانونی گزرگاہ بھی ہے اور غیر قانونی بھی۔ اٹک ہی کے تناظر میں وہ ہماری اپنی گھریلو صنعت ”اپنے ہی ملک میں سمگلنگ“ کا تذکرہ کچھ یوں کرتے ہیں۔

”سرکار کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ سرکاری ملازم پیٹ پر پتھر تو نہیں باندھ سکتے۔ عام آدمی کی پکڑ دھکڑ، سمگلروں کے لیے چشم پوشی۔“

داستان لذیذ ہے مگر مضمون میں گنجائش لامحدود گنجائش۔ چیدہ چیدہ جملے عرض کرتے ہوئے اختتام کی طرف بڑھتا ہوں۔

”ویسے تو سرکاری ملازم کے لیے تحفے تحائف لینا ممنوع تھا لیکن دو چیزوں کی قانوناً اجازت تھی۔ فروٹ اور فلاور۔ اسی کو مقامی اصطلاح میں ڈالیاں کہا جاتا تھا۔“

”سردار کوٹ کو حکومت نے سپین کا سفیر بنا کر بھیجا۔ اُن کی اولاد نرینہ نہ تھی۔ بچیاں انگلش میڈیم سکول میں داخل ہوئیں تو ملک اللہ یار بڑا جز بز ہوا اور کہیں کہہ بیٹھا ”کیا ماموں نے اُن سے نوکری کروانی ہے؟“ بات اُڑتے اُڑتے سردار کوٹ تک جا پہنچی۔ انھوں نے رشتہ دینے سے یکسر انکار کر دیا۔ نواب صاحب کی اکڑی ہوئی گردن میں پہلی بار خم آیا۔ تنی ہوئی مونچھیں بتیس ڈگری نیچے آ گئیں۔ منت سماجت، ناراضی، کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ سردار صاحب نے رفع شر سے بچنے کے لیے اس کی شادی چکوال کے چودھری ممتاز سے کر دی جو اس وقت فوج میں کپتان تھا۔ تیسری اپنے یتیم بھانجے سے بیاہ دی۔ کہاں سپین کے سکولوں میں پڑھی ہوئی سردار زادی اور کہاں

فتح جنگ کا نیم خواندہ نوجوان - وہ ساری زندگی بیگم سے دب کر رہا۔ اگر گائے بھی بیچنا ہوتی تو گاہک کو کہتا۔ میں درالاں کول پچھ کے دساں گا (میں بیگم سے پوچھ کر بتاؤں گا)۔ اس کی واحد شناخت اپنے سسر کی دی ہوئی بیس ڈانگ لمبی امپالاٹھی جس میں بیٹھ کر سرِ شام پنڈی کے شیزان ریسٹورنٹ میں آ بیٹھتا سر پر سفید سواتی ٹوپی رکھتا جس پر مور کا پر لگا ہوتا۔ اکیلے آتا، اکیلے بیٹھتا، ایک کپ چائے کا منگواتا۔ بالفرض کوئی پیٹی یا پیسٹری کھانے کو جی چاہتا تو احتیاطاً قیمت پوچھ لیتا۔ اس کے آتے ہی یار لوگ کنکھیوں میں ایک دوسرے کو اشارے کرتے اور زیرِ لب کہتے۔ واحد متکلم"۔

"حضرو اور شمس آباد کی زمینداریاں بڑی تو نہیں تھیں لیکن زمینیں سونا اگلتیں۔ تمباکو کی فصل صرف کیش کراپ (Cash Crop) نہیں بلکہ عیش کراپ تھی۔ سر ٹامس مور جہانگیر کے لیے تمباکو کا تحفہ کیا لایا، سارے ہندوستان میں دھوئیں کے مرغولے اُڑنے لگے۔ حضرو والوں نے اس میں مزید جدت پیدا کی۔ ان کا تمباکو پودوں سے الگ ہو کر کئی رنگ اور کئی روپ اختیار کر لیتا۔ پسنے اور گھسنے کے بعد جب یہ نسوار کے قالب میں ڈھلتا تو ذائقہ کو نئے معانی ملتے۔ جب عادی لوگ شلوار کے نیفے میں اڑسی ہوئی پتلی سی ڈبیا سے چٹکی بھر نم آلود سرمئی سفوف نکال کر نچلے ہونٹ اور دانتوں کے درمیان رکھتے تو انھیں زمین گھومتی اور آسمان ناچتے ہوئے نظر آتے۔ اس کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے اور محاورے وضع کیے گئے۔ "توں حضرو جا کے نسوار گھوٹ" یہ استہزایہ جملہ تھا۔ اور "میں نسوار گھوٹ کے جوان نہیں ہویا" فخریہ جملہ۔

ایک دعوت کی روئیداد ملک سلیم اقبال کی زبانی یوں ہے۔

مرزا غالب نے اپنی کسی دعوت کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا اگر برتن دیکھو تو یزید کا دسترخوان پتا دیتا ہے اور اگر ماکولات پہ نگاہ ڈالیں تو بایزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے۔ ملک اللہ یار کا دسترخوان ہر اعتبار سے بایزید کا مطبخ معلوم ہوتا تھا۔"

"شاہ داستاں" کی اس قسط کا اختتام رئیس خانہ پر ہوا ہے۔ بیاض مارچ 2016 آپ کے پاس محفوظ ہو تو یہ قسط پھر پڑھیں۔ یاد آیا کہ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "رئیس خانہ" سب رنگ ڈائجسٹ میں چھپا تھا۔ فرصت نہ بھی ملے تو تلاش کر کے افسانہ "رئیس خانہ" بھی پڑھیں۔

شاعری کی اہمیت اپنی جگہ مگر نثر بہت کمال کی شے ہے۔ بہت کچھ سکھاتی ہے اور نئی دنیاؤں کی سیر بھی کرا دیتی ہے۔ پورا انسان بننے کے لیے دستیاب لٹریچر کا مطالعہ کر لینا بھی بہت کافی ہے۔ مطالعہ کی عادت ڈالیے..... قسم سے، مطالعہ بہت کچھ سکھاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر تھانگ منگ شنگ سے ملاقات

سلمیٰ اعوان

بیجنگ میں مجھے کس ادیب اور کس شخصیت سے ملنے کی ضرورت ہے؟ شعیب بن عزیز سے بہتر بھلا میرا کون صلاح کار ہوسکتا ہے؟ مدعا گوش گزار کیا۔

''ظفر محمود سے بات کرو۔ چین پر اتھارٹی کی سی حیثیت رکھتا ہے۔'' ظاہر ہے اب ظفر محمود کو ہی آواز دینی تھی۔ سو دی۔ انہوں نے ایک فون نمبر لکھوایا۔ تھانگ منگ شنگ کا نام بتایا۔ یہ بھی کہا کہ موصوف شعبہ پاک چین سٹڈیز پیکنگ یونیورسٹی کے سربراہ ہیں۔ اُن سے ملنا آپ کے لیے ضروری بھی ہے اور فائدہ مند بھی۔

عمران (داماد) نے سفارت خانے کے پریس آتاشی سے بات چیت کے بعد بتایا کہ موصوف پاک چین دوستی کے حوالے سے بہت متحرک شخصیت ہیں۔

پس تو آج تھانگ منگ شنگ سے ملنے جانا تھا۔ کل شام عمران نے بات کی تھی۔ وقت مانگا تھا۔ اپنا حوالہ دیا تو تصدیق مانگی جو اس نے فوراً دی اور دس بجے صبح کا وقت طے ہوگیا تھا۔

پیکنگ یونیورسٹی کہیں اللہ میاں کے

پچھواڑے ہی تھی۔ عمران نے اسے بیجنگ کا جنوب کہا تھا۔ میرے حسابوں سمت خواہ مشرقی ہو یا مغربی، شمالی ہو یا جنوبی سبھی ہر جا ایک سے ہوں گے سو بات صد درست تھی۔ وہی نظر نواز عمارتیں، کہیں آسمان کو چھوتی اور کہیں درمیان میں لٹکی معلّق، وہی اور ہیڈ برجوں پر چڑھتے اترتے لوگ، وہی کناروں پر سائیکلوں اور سکوٹیوں پر بیٹھی عورتیں اور لڑکیاں، وہی ٹریفک کا اژدھام، گاڑیوں کی ریل پیل، وہی میرے حاسدی دل سے اٹھتی ہوکیں۔

یونیورسٹی بارونق جگہ پر تھی۔ شاندار عمارتوں کے سلسلے، سرسبز لان اور طلبہ کی دائیں بائیں آنیاں جانیاں۔ اپنا وقت یاد آیا تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی یاد آئی تھی۔ جہاں کہیں چین نواز اور کہیں روس نواز لڑکیاں ماؤ اور لینن کے نعرے لگاتی تھیں۔ تب سوچا کرتی تھی یہ ماؤ اور لینن کتنے بڑے لیڈر ہیں؟ کوئی بیٹھا چین میں اور کوئی روس میں ہے۔ پر اجنبی ملکوں کے لڑکے لڑکیاں ان کے لیے پاگل ہو رہے ہیں۔ اور تب کیا میں نے لمحہ بھر کے لیے بھی سوچا تھا کہ میں عمر کے کسی حصے میں ان بڑے لوگوں کے دیس جاؤں گی۔ یقیناً نہیں۔

گاڑی جب پارکنگ ایریا میں پارک کی تو وقت بھی کوئی پونے دس کا تھا۔ ایک دو لوگوں سے پوچھا۔ کچھ صحیح چلے کچھ غلط۔ ڈپارٹمنٹ تو دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ سامنے ایک سہ منزلہ عمارت تھی۔ سوچا چلو ذرا گھومتے پھرتے ہیں۔ ایک جانب قدرے ویرانے میں اترتی سڑک پر ہو لیے۔ پھر کال کی۔ تھوڑی سی راہنمائی اور جھیل کی طرف آنے کی ہدایت کی گئی۔ راستے پتھریلے تھے۔ باڑیں خوبصورت اور گردونواح حسن و رعنائی سے بھرا ہوا تھا۔ خصوصی طور پر وہ بلند و بالا منفرد ٹائپ کا پگوڈا جس کے عین سامنے انتظار کا کہا گیا تھا۔ سامنے ایک وسیع و عریض جھیل پھیلی ہوئی تھی۔ مگر کشتیاں کہیں نہیں تھیں؟ بھلا یونیورسٹی کی جھیل ہو اور کشتیوں کے بغیر۔ رومانس کہاں ہوتا ہوگا؟ چینی کیا اتنے روکھے پھیکے سے ہیں۔

اب داماد سے سن گن لینے لگی۔ ساتھ ہی تصویر کشی بھی شروع کر دی۔

ساس اور داماد تصویر کشی میں مصروف تھے جب وہ تشریف لائے۔ درمیانی قامت پر قدرے فربہی مائل جسم۔ محبت سے ملے چند تصاویر ان کے ساتھ بھی بنوائیں۔ اور آفس

کی طرف بڑھے جو قریب ہی ایک مختصری دو منزلہ عمارت میں تھا۔ عمارت میں سناٹا تھا۔ نائب قاصد یا چپڑاسی نام کا کوئی بندہ نہ بندے کی ذات کا یہاں وجود نہ تھا۔ کمرہ اوپر کی منزل میں تھا مگر خدا کا شکر کہ سیڑھیاں انتہائی آرام دہ تھیں۔ اتنی بڑی پوسٹ کے بندے کا کمرہ چھوٹا ہی نہ تھا بلکہ سادگی میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔ میز کمپیوٹر، پرنٹر اور ریسرچ کے پیپروں سے بھری کچھ کہانیاں سناتی تھی۔ میرے حسابوں ان کی پوسٹ یا عہدہ اکیسویں گریڈ سے کیا کم ہوگا؟ مگر پاکستان جیسے غریب ملک میں اس عہدے کے بندے کی دفتری شان و شوکت اور کروفر کا دیکھنے سے تعلق ہوتا ہے۔ کمرے کے کسی کونے میں کسی چھوٹی موٹی میز پر کوئی الیکٹرک کیتل چائے یا قہوے کے کپ کوئی ٹی بیگز کا ڈبہ کچھ نہ تھا۔ کمرے کے جائزے سے فارغ نگاہیں اب ان پر جم گئی تھیں۔ ”کچھ پاکستان بارے اپنے تاثرات بتائیے۔ اتنا آنا جانا لگا رہتا ہے آپ کا۔“

کچھ بتانے کچھ کہنے کے بجائے سب سے پہلے انہوں نے ایک پاکستانی ادیبہ بارے پوچھتے ہوئے کہا۔ ”اب نام یاد نہیں آرہا ہے۔ پر یقیناً بہت سے حوالے یاد تھے انہیں۔ غصیلی ہے۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی ہے۔ بحث بہت کرتی ہے۔ کالم نگاری کمال کی ہے۔ شاعرہ بھی ہے۔ عورتوں کے حقوق بارے بھی بڑی متحرک ہے۔“ بڑی معصومیت سی تھی لہجے میں۔ ”کشور ناہید کی بات کرتے ہیں شاید آپ۔“ ”ہاں ہاں“ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

میری یادوں میں اپنا پہلی بار پاکستان جانا یاد ہے۔ پاکستان جانے کا ایک کریز تھا۔ میرے جانے کی خبر جب میرے قریبی عزیزوں کو ملی تو اُن کی فرمائشیں شروع ہو گئیں۔ ہمارے لیے گھڑی لانی ہے۔ کوئی جوتوں کی بات کرتا تھا۔ 1980 سے 1987 تک کے دوران مجھے یاد ہے چینیوں کی پاکستان جانے والوں سے کچھ ایسی ہی فرمائشیں اور مطالبات ہوتے تھے۔ اس وقت 240 فی کس آمدنی ایک پاکستانی کی اور چینی کی 140 فی کس تھی۔ مگر اب معاملات کی صورت یکسر فرق ہو چکی ہے۔ آج پاکستانی فی کس 1600 اور چینی 4000 ہزار۔ اور یہ بھی کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ یہی وہ

پاکستان ہے جس کو ہم 1970 میں اپنا استاد مانا کرتے تھے۔ 1960 میں ان کے کراچی جیسے شہر کو دیکھ کر حسرت سے کہتے کہ کاش ایسا ایک شہر ان کے پاس بھی ہو۔ جہاں اتنی فلک بوس عمارتیں ہیں۔

ایک دو پل کی خاموشی کے بعد پھر گویا ہوئے۔ چینی لیڈروں نے اپنے لوگوں کو ایک خواب دکھایا تھا۔ چین کی نشاۃ ثانیہ کے حصول کا خواب۔ چین کی پرانی اور نئی نسل کی امنگوں کا ترجمان جس میں اقتصادی، سیاسی، ثقافتی، سماجی اور ماحولیاتی ترقی جیسے اہم عناصر شامل تھے۔ ترقی کے اوائل 1987 کے دن جب دنیا سے کٹی ہوئی اس قوم کو صرف چھ انڈے اور آدھ کلو چینی پورے ماہ کے لیے ملتی تھی۔

اگر آج ہم دنیا کی دوسری اکنامک پاور ہیں تو تعاقب میں جدوجہد بھی بے مثال ہے۔ محض چالیس سال میں اس قوم اور ملک نے اپنے اہداف حاصل کیے اور مزید کے لیے سرگرم ہے۔ ایسے ہی خواب ہماری حکومتوں نے پاکستانیوں کو بھی دکھائے۔ ان کی طرف بڑھنے اور ان کی تکمیل کرنے کو کہا اور دل سے چاہا کہ وہ کامیاب ہوں۔ مگر مجھے دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ پاکستانی حکومتیں سنجیدہ نہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پاکستان اقتصادی ترقی میں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

میرے دل کی دنیا ان باتوں سے بڑی اتھل پتھل سی تھی۔ کیسی بدنصیب قوم ہیں ہم۔ اس تنزلی اور زوال کی وجوہات سے میں اپنے حسابوں آگاہ تو تھی۔ مگر ڈاکٹر تھانگ کا نقطہ نظر کیا تھا؟ یہ جاننا بھی تو ضروری تھا۔ تو سوال ہوا اور جواب کچھ یوں تھا۔ میرے حسابوں آپ کی قوم میں چند چیزوں کا فقدان ہے۔ یہ ذہین ہیں۔ مگر پتہ مار کر کام کرنے کی عادت نہیں۔ شارٹ کٹ راستوں کے متلاشی رہتے ہیں۔ راتوں رات امیر بننا چاہتے ہیں۔ ویسے اثاثوں اور پیسوں کی تقسیم تو 5 فی صد کے ہاتھوں میں ہے۔ امیر غریب کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ سیاسی استحکام نہیں اور اسے پیدا ہونے بھی نہیں دیا جاتا۔ قابض لوگ نظام کی بہتری کو متاثر کرتے ہیں۔

اچھی مخلص، سمجھدار اور ایماندار لیڈر شپ کا بھی بحران رہا۔ کچھ مخلص اور کرشماتی شخصیت کے لیڈر ملے بھی۔ وہ آئے بھی۔ انہیں کام کرنے کا موقع دینے کی ضرورت

تھی - مگر سازشوں اور غیر جمہوری ہتھکنڈوں سے بساط سیاست ہی لپیٹ دی گئی- بھئی تانگیں نہ کھینچو- قومی نوعیت کے پروگرام کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتے- ان پروگراموں کا تسلسل حکومتوں کے آنے جانے سے متاثر نہیں ہونا چاہیے- آئیڈیل لوگ اور آئیڈیل نظام کہیں نہیں ملتا- ہمارے ہاں ماؤ جیسے فکری لیڈر کے ہاں بھی غلطیوں کے ڈھیر ہیں- مل کر چلنے کی ضرورت ہوتی ہے - کہیں خود پیچھے ہٹیں- کہیں انہیں ہٹائیں- ایک دوسرے کو space دیں تاکہ انہیں بھی آسمان نظر آئے-

میں پندرہ بیس سال سے پاکستان مسلسل آجارہا ہوں - پاکستان کو ٹھوس اقدام اٹھانے ہوں گے- گذشتہ پانچ سالوں سے سی پیک پر جس رفتار سے ترقی ہونی چاہیے- نہیں ہوئی-

اگر میں صرف 2018 کی پاکستان جانے کی تفصیلات کا ذکر کروں تو یہی صرف دس کے قریب ہوتی ہیں - کہیں مختلف سیمناروں میں اور کہیں انڈسٹریل زون کا رپوریشنوں پر بات چیت کے لیے- مگر مجھے بہت دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ پاکستان میں کوئی 110 کے قریب زون ہیں لیکن ان کی پالیسیاں ہی واضح نہیں- سیمناروں کا رواج زیادہ بڑھ گیا ہے میری تمنا عملی طور پر سیمناروں کی ہے نہ کہ روٹین کی خانہ پریاں- نشستند و برخاستند والی بات نہیں ہونی چاہیے -اہل شعور لوگوں کو ان سیمناروں میں پورا لائحہ عمل دیں- وقت کا تعین ٹھوس اقدامات اور عمل ہو- پاکستان میں ترقی کی رفتار بہت تیز ہونی چاہیے ہے-اب چین میں تین چھٹیاں بھی وارد ہیں پہلے بہت کم تھیں-

پاکستانیوں کی ایک عادت سے بھی مجھے بہت شکایت ہے کہ ابھی دفاتر میں کام پوری طرح شروع بھی نہیں ہوا کہ چائے کے لیے گھنٹیاں بجنی شروع ہو جاتی ہیں- چائے اور وہ ماشاء اللہ سے دودھ والی- اکثر تو کڑک والی پیتے ہیں- پھر یہ سلسلہ ہر میل ملاقاتی کی آمد پر جاری رہتا ہے-

سچی بات ہے- میرا دلی تعلق اس ملک سے ہے- میں سمجھتا ہوں اگر آپ چاہنا سے محبت کرتے ہیں تو پاکستان سے بھی محبت کریں-

☆☆☆☆☆

کچھ پرانی ادبی یادیں.....

یہ 30 مئی 2004ء کی ایک خوشگوار شام کا ذکر ہے۔ ہمدرد ہال میں حلقہ ارباب ذوق کا 65 واں سالانہ جلسہ تھا اور ممتاز افسانہ نگار سید قاسم محمود صدارتی خطبہ پڑھ رہے تھے۔ کیا یادگار خطبہ تھا۔ سید قاسم محمود دھیرے دھیرے، اپنی حلقے سے وابستگی اور یادوں کو بیان کر رہے تھے:

"حلقے سے میری محبت کی تاریخ ۵۵ سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ صاحبو! حلقے نے مجھ دہقان زادے کو تہذیب سکھائی، عشق سکھایا، ادب سکھایا، آداب سکھائے، اہل ادب کے رتبہ عالی کا احترام کرنے کی فضیلت بتائی زندگی کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں رکاوٹ پیدا ہو جائے تو اسے دور کرنے کا سلیقہ سکھایا۔

کبھی کبھی بدمزگی کا رنگ ادبی ظرافت کا نمونہ بن جاتا۔ اے حمید نے افسانہ پڑھا "حسن اور روٹی" (غالباً یہی نام تھا) سعادت حسن منٹو نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا: "اے حمید کا کیا ہے؟ وہ تو کھمبا دیکھ کر بھی رومانٹک ہو جاتا ہے" حاضرین نے یہ سن کر قہقہہ لگایا لیکن بعض سنجیدہ نقادوں نے اس کا نوٹس لیا اور کہا کہ اس قسم کے ذاتی ریمارکس نہیں دینے چاہئیں۔ منٹو صاحب زود رنج آدمی تھے۔ غصے میں تھرا کر میری طرف دیکھا: سیکرٹری صاحب!" میں نے جو کچھ کہا ہے' یہ سنجیدگی سے کہا اور ادبی تنقید کا حصہ ہے، اسے میرے نام سے ریکارڈ کیا جائے۔"

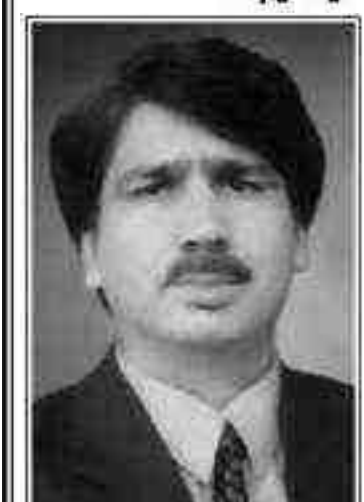

اختر شمار

اگلے اتوار منٹو صاحب سب سے پہلے بورڈ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ محمود نظامی صدر محفل تھے۔ میں کارروائی پڑھ چکا اور توثیق سے پہلے صدر صاحب نے حاضرین سے کوئی اعتراض مانگا تو منٹو صاحب نے اُن سے تو کچھ نہیں کہا، اے حمید کے بارے میں اپنی رائے درج رجسٹر نہ کرنے پر مجھے مخاطب کر کے وہ کچھ کہہ ڈالا، جو ذرا سی مزید آنچ سے "امرتسری گالیاں" بن جاتیں۔ کبھی کبھی اختلاف رائے سے ایسی بدمزگی پیدا ہوتی جو بشری کمزوری سے ہوتی ہوئی جسمانی طاقت آزمائی اور جدید اصطلاح میں دہشت گردی کا مظاہرہ بن جاتی۔ ایک روز میں اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا دیکھتا کیا ہوں کہ حاضرین بلکہ حلقے کے ارکان آپس میں دست و گریباں ہیں، پھر اچانک ایک دوسرے پر کرسیاں اُٹھا اُٹھا کر مارنے لگے۔ منیر نیازی نے پروفیسر سید سجاد رضوی کے کاندھے پر جو کھینچ کر کرسی ماری تو بلبلا اُٹھے، اب منیر نیازی نے دوسری کرسی اُٹھائی اور نیچے گرے ہوئے پروفیسر پر ضرب کاری لگانے والا ہی تھا کہ میں امن نافذ کرنے والے ادارے کے ہر اول دستے کے طور پر جھپٹا اور منیر نیازی کی اُٹھائی ہوئی کرسی کو اپنے اوپر روک لیا۔ منیر نیازی نے نیازی پٹھانوں والے اپنے مضبوط ہاتھ سے میری گردن دبوچ لی "۔ اوہ شکرے، تو بھی، تیرے تو بال و پر نوچ کر نیچے پھینک دوں گا۔"

میرے حلق سے خرخر کی آوازیں نکلنے لگیں۔ میں نے داؤ مار کر اپنا ہاتھ منیر نیازی کی پچی کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ اُس نے مروڑی دے کر گھٹنے کی ضرب سے مجھے پروفیسر صاحب کے اوپر گرا دیا۔ یہ جو میرے حلق کے بیچ شہ رگ کے پاس ایک گلٹی نکلی ہوئی ہے، شوکت خانم کینسر ہسپتال والے خواہ مخواہ اس پر سرطان کا شبہ کر رہے ہیں۔ یہ تحریر لکھتے وقت اچانک خیال آیا کہ ہو نہ ہو وہ جو اس شام منیر نیازی نے بے رحمی سے میرا گلا دبوچا تھا یہ اُسی کا شاخسانہ ہے۔ اب منیر نیازی کہیں مل جائے تو اسے چھوڑوں گا نہیں۔ اب تو وہ اس بے وفا شہر میں نظر ہی نہیں آتا۔"

عزیز قارئین آپ جانتے ہیں کہ اب منیر نیازی ہے اور نہ سید قاسم محمود مگر حلقہ ارباب ذوق موجود ہے۔ میں جب لاہور آیا تھا تو

صرف پاک ٹی ہاؤس سے آگاہ تھا کہ ایک زمانے سے سُن رکھا تھا کہ لاہور میں ایک چائے خانہ ادیبوں شاعروں کا وہ گوشہ عافیت ہے جہاں ہر نسل کا لکھاری پایا جاتا ہے۔ پاک ٹی ہاؤس میں حلقہ ارباب ذوق کے ہفتہ وار تنقیدی اجلاس بھی منعقد ہوتے تھے۔ اُن دنوں حلقہ ارباب ذوق مرکز بھی ہوتا تھا۔ جس کے اجلاس چائنیز لنچ ہوم میں مبارک احمد منعقد کراتے تھے۔ مبارک احمد نے اپنی سائیکل اور نثری نظم کے حوالے سے شہرت پائی۔ پاک ٹی ہاؤس کے آس پاس دو تین جگہوں پر ادبی رونقیں دیکھنے کو ملتی تھیں۔ چائنیز لنچ ہوم میں حلقہ (مرکز) اور اس کے تہہ خانے میں حلقہ ادب کے اجلاس ہوتے تھے۔ وائی ایم سی اے ہال میں پنجابی ادبی سنگت، اور قریب ہی پرنس ریسٹورنٹ میں حلقہ تصنیف ادب کے پروگرام ہوتے تھے۔ پنجابی ادبی سنگت اور حلقہ کے اجلاس ان دنوں ایک ہی روز ہوا کرتے تھے۔ ہم پہلے پنجابی ادبی سنگت کے اجلاس میں شرکت کرتے، کچھ دیر بیٹھتے اور اگر مطلب کا پروگرام نہ ہوتا تو پچھلی نشستوں سے اُٹھ کر پاک ٹی ہاؤس میں حلقہ کے اجلاس میں جا بیٹھتے۔ ادبی اجلاسوں میں بعض اوقات "بے ادبیاں" بھی سرزد ہو جاتی ہیں۔ ادیبوں کی آپس میں "شکر رنجیاں" کوئی نئی بات نہیں۔ ایک بار ہم قدرے تاخیر سے پہنچے تو رشید مصباح اپنی ہیلمٹ جھولتے گھماتے ٹی ہاؤس سے باہر نکل رہے تھے۔ وہ غالباً خالد احمد سے جھگڑتے ہوئے باہر آکر دو دو ہاتھ کرنا چاہتے تھے مگر خالد احمد سگریٹ سلگائے دھیرے دھیرے اپنی منڈلی کے ساتھ ایک طرف ہو لئے۔ مجھے یاد ہے پاک ٹی ہاؤس میں ایک بار کسی صاحب سے جھگڑنے کے بعد ہمارے پیارے شاعر علی اصغر عباس، پولیس کے دو سپاہی لے کر پاک ٹی ہاؤس پہنچ گئے تھے مگر دوستوں نے بیچ بچاؤ کرا کے سپاہی واپس بھیج دیئے۔ اس تمام صورت حال کے باوجود وہ بہت اچھے دن تھے۔ ہفتہ وار ادبی اجلاسوں کے علاوہ، شیزان، جناح ہال، پنجاب پبلک لائبریری اور کئی دوسرے جگہوں پر ادبی تقریبات منعقد ہوتی تھیں۔ حلقے کی تنقیدی نشستوں میں "منہ زبانی نقاد" بھی اپنی رائے کا اظہار کیا کرتے۔ یہ وہ ناقدین تھے

جنہوں نے تنقیدی مضامین کم ہی لکھے، البتہ "گفتار کے غازی" مشہور ہوئے۔ بعض افسانہ نگار اور شاعر ان نشستوں میں "جارحانہ" گفتگو کے سبب مشہور تھے۔ ان میں ڈاکٹر انیس ناگی، سعادت سعید، رشید مصباح شامل تھے۔ بزرگ افسانہ نگار اور "اوہ کھایا امرود" جیسی کتاب کے مصنف خان فضل الرحمان اجلاس سے کچھ دیر پہلے آجاتے۔ بعض اوقات وہ مغرب کی نماز ٹی ہاؤس کی کرسی پر بیٹھے بیٹھے ادا کرتے۔ عموماً اگلی نشستوں پر نظر آتے اور تنقید کے لئے پیش ہونے والی تخلیق پر سب سے پہلا تنقیدی جملہ انہی کا ہوا کرتا تھا۔ وہ دوٹوک انداز میں صرف ایک جملے میں اپنا تاثر یوں ریکارڈ کراتے:

"صاحب صدر! یہ افسانہ بالکل بکواس ہے۔ بس لوگوں کا وقت ضائع کیا گیا ہے" وغیرہ وغیرہ۔"

حلقہ میں غزل، نظم پیش کرنے والے اپنے اپنے حواریوں کے ساتھ آتے اور پھر یہاں پیش کی جانے والی تخلیقات پر وکیلوں کی طرح جرح ہونے لگتی۔ اس جرح میں کبھی بات بڑھ جاتی اور اجلاس کے خاتمے پر نوبت ہاتھا پائی تک بھی آجاتی لیکن ایسے کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ میں جب لاہور آیا تو یہاں ظہیر کاشمیری، سیف الدین سیف، عارف عبدالمتین، صلاح الدین محمود، قتیل شفائی، احمد راہی، شہرت بخاری، انجم رومانی اور سجاد باقر رضوی جیسے بزرگ بھی تقریبات میں نظر آتے تھے۔ حلقہ تصنیف ادب نوجوانوں کا حلقہ تھا جسے غضنفر علی ندیم جیسا بھلے مانس شاعر جاری رکھے ہوئے تھا، یار لوگ اسے بابائے تراکے کہا کرتے تھے۔ پنجاب ادبی سنگت اس وقت پنجابی غزل کے جدید شاعر پرویز ہاشمی چلا رہے تھے۔ حلقہ ادب حفیظ الرحمٰن احسن، تحسین فراقی اور جعفر بلوچ کے دم سے قائم تھا۔ آج کے بہت سے اہم لکھنے والے اس وقت ان اجلاسوں میں نظر آتے تھے۔ لاہور کے دبستان کا ذکر کرتے ہوئے قدرے گمنام شاعر نذیر کھتولوی کا شعر آپ کی نذر ہے:

اشکوں سے ہیں نظیر کی آنکھیں بھری ہوئی
پھرتا ہے کشتیوں میں سمندر لیے ہوئے

☆☆☆☆☆

پروین شاکر نسوانیت کی علمبردار شاعرہ

ہم جیسے کسی خوشنما مشکبار پھولوں کے کنج کے درمیان بیٹھے ہوں۔ ان مشکبار مہکتے گوشے کی ہر خوشبو کو محسوس کر رہے ہوں۔ تو نہ صرف اردگرد کا ماحول بلکہ اذہان پر اسکا اس قدر مثبت اثر ہو جائے کہ محسوسات تک اثر پزیر ہو جائیں اور اس معطر و خوشبودار ماحول میں قلب و ذہن پہ ایسی دلفریبی چھا جائے کہ بے ساختہ شاعری کا انبوہ کثیر کا مدوجذر لہو میں گردش کرنے لگتا ہے اور قدرت سے والہانہ محبت کا اظہار بھی ازخود زبان سے ادا ہونے لگتا ہے۔ یہ صرف ظاہری اور پرکشش اشیا ہیں۔ یوں باطنی احساسات کا اظہار بھی روح سے نکل کر صفحہ قرطاس پر روشنی بن کر بکھر جاتا ہے۔

یہ سب اس شاعرہ کی شاعری کے مرہون منت ہے جسے دنیائے ادب ”پروین شاکر“ کے نام سے جانتی ہے۔ ابتدا میں ان کی ایک معرکۃ الآرا نظم:

نوید

سماعتوں کو نوید ہو__ کہ
ہوائیں خوشبو کے گیت لیکر
دریچۂ گل سے آرہی ہیں

....

ماحول اور جذبات کی جو عکاسی اس مختصر نظم میں کی گئی ہے۔ وہ شاید ہی شاعری میں مل سکے۔ شاعری اور وہ بھی پروین شاکر کی شاعری ہو، جو نگاہوں کو تراوٹ اور سماعتوں میں رس گھولتی ہے۔ دل کے اندر بولتی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے ہر ذی روح خاص طور پر نسوانیت کی علمبردار ہو۔ الہڑ نوخیز لڑکیاں اسے پڑھکر لبوں پر مسکراہٹ سجالیتی ہیں۔ چہرہ آنچل میں چھپا کر مدھر

فصیحہ آصف خان

ہلسی، ہنستی ہیں۔
سبز مدھم روشنی میں سرخ آنچل کی دھنک
سرد کمرے میں مچلتی گرم سانسوں کی مہک
شرمگیں لہجوں میں دھیرے دھیرے کچھ چاہت کی بات
دو دلوں کی دھڑکنوں میں گونجتی تھی اک صدا
کانپتے ہونٹوں پہ تھی اللہ سے صرف اک دُعا
کاش یہ لمحے ٹھہر جائیں، ٹھہر جائیں ذرا

.....

محبتوں میں دو دل چاہت سے معمور ہوتے ہیں، تو وصال لمحوں کے ٹھہر جانے کی آواز دل میں پنپتی ہے اور اگر وصال لمحوں کے بعد ہجر و فراق کے زرد موسم زندگی پر حاوی ہو جائیں تو مرادوں بھرا دل یاس و ناامیدی کی کشتی میں ہچکولے کھانے لگتا ہے۔ درد کی راتیں طویل ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں کربناک ٹیسیں قلب و جان سے اُتر کر درد بھرے اشعار تخلیق کرتی ہیں اور خوشنما خواب بُننے والی آنکھیں آنسو پروتی ہیں۔

ہجر کے پانیوں میں عشق کی ناؤ
کہیں غرقاب ہو گئی شاید

.....

ہم بھی ترے بعد جی رہے ہیں
اور تو بھی کہیں بہل رہا ہو گا

.....

آنکھوں سے کون میری، میرے خواب لے گیا
چشمِ صدف سے گوہرِ نایاب لے گیا

.....

ایک نظم "توقع" دل کا حال یوں بیان کرتی ہے۔

جب ہوا
دھیمے لہجوں میں کچھ گنگناتی ہوئی
خواب آسا، ساعت کو چھو جائے، تو
کیا تمھیں کوئی گزری ہوئی بات یاد آئے گی

.....

ایک لڑکی کی زندگی خوابوں جیسی ہوتی ہے۔ وہ ہر پل، ہر لمحہ دل فریب خواب دیکھتی ہے۔ کسی اچھے ہمسفر کے، کسی پناہ گاہ کی طرح اسے چاہتی ہے۔ حادثات و واقعات سے نبرد آزما رہتی ہے۔ کبھی ذرا سی بات بہت بڑی لگتی ہے۔ محبوب کی بے رُخی اور بے وفائی پر نازک دل ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے، تو ذیل کے اشعار اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں، جو دل شکن بھی ہیں اور دلگداز بھی:

خوشبو ہے، چاندنی ہے، لب جو ہے اور میں
کس بے پناہ رات میں تنہا کیا مجھے

.....

وہ اپنی ذات میں ایک مکمل کائنات تھا
دنیا کے ہر فریب سے ملوا دیا مجھے

.....

ویسے تو کج ادائی کا دکھ کب نہیں سہا
آج اس کی بے رُخی نے مگر دل دکھا دیا

میں برگ برگ اسکو نمو بخشتی رہی
وہ شاخ شاخ میری جڑیں کاٹتا رہا

.....

شکوے شکایت، وسوسے، اندازے، قیاس آرائیاں، امید نا امیدی بھروسہ، بے اعتباری، بے وفائی، سب محبت کا فلسفہ ہیں۔ کچھ اشعار انہی جذبات کے عکاس ہیں ملاحظہ فرمائیں:

میں تو پاؤں کے کانٹے چنتی رہی
اور وہ راستہ بدلتا رہا

.....

پھر اس کے بعد نہ دیکھے وصال کے موسم
جدائیوں کی گھڑی چشم گیر ایسی تھی

.....

وہ تو جان لے کے بھی ویسا ہی سبک نام رہا
عشق کے باب میں سب جرم ہمارے نکلے

.....

پروین کی شاعری فطرت کی شاعری کہلاتی ہے۔ نوخیز جذبات کی شاعری مدھر احساسات کی شاعری، نازک اندام لمحوں کو ملتا کی شاعری، نازک لطیف، مسحور کن احساسات کی شاعری، پروین نے اپنی پُرفسوں شاعری میں تشبیہات کا استعمال انوکھے اور دلکش انداز میں کیا ہے۔

چاند، خوشبو، موسم، بہار، خواب، رنگ، پہاڑ، جھیلیں، تتلیاں، ہوا، بادل، حیا، شگوفے، تیتری، سرخی، مہک، رات، خواب، چاندنی، برف، آنکھیں، شام جگنو، الغرض فطرت کا کونسا رنگ ہے جس کی انھوں نے تشبیہ نہ دی ہو۔ انھوں نے ایسے ایسے استعارے استعمال کیے ہیں کہ پڑھنے والا محو ہو جاتا ہے:

دو رویہ پیڑوں کے بیچ
رستے جل بھی جاتے ہیں
صرف ہوا پہ کیوں تعزیر
پھول مسل بھی جاتے ہیں

.....

پروین کی شاعری ہمہ جہت شاعری ہے صرف مایوسی کو اور نا امیدی اور افسردگی ہی نہیں، بلکہ انھوں نے ایک پُرعزم شخصیت کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ بے شک جب دل میں دراڑ پڑتی ہے تو آنکھیں جل تھل ہو جاتی ہیں:

ہنسی کو اپنی سن کے ایک بار میں بھی چونک اٹھی
مجھ میں یہ دکھ چھپانے کا کمال کیسے آگیا

.....

آسان سہی بچھڑ کے رہنا
پر اس کا سا دل کہاں سے لائیں

.....

درد اور اشکوں کا ساتھ، زندگی کے ساتھ سائے کی طرح رہتا ہے۔ زخم، زخم آنکھ سے ٹپکنے والا درد اصل میں وہ سچے موتی ہیں جو آنسو کہلاتے ہیں۔ پروین نے ایک نسوانی

انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

موتی ہار پروئے ہوئے
دن گزرے ہیں روئے ہوئے

.....

یہ چشم نم ہے اسے خشک دیکھ بھال کے کر
ہری بھری کوئی بستی ہی زیر آب نہ ہو

.....

میرے دل آنسوؤں سے ہاتھ اُٹھا
کس بارش سے زخم دھوتا ہے

.....

شام ہوتے ہی مری پلکوں پہ
یہ کون ہار سا پروتا ہے

.....

وقت ایک سا نہیں رہتا۔ انسان کو حالات کے ساتھ تبدیل ہونا پڑتا ہے۔ اگر ایک ہی جیسا وقت نہ گزرے، تو غم گھٹے نہ خوشی کا احساس ہو پائے:

عشق نے سیکھ ہی لی وقت کی تقسیم کہ اب
وہ مجھے یاد تو آتا ہے مگر کام کے بعد

.....

عرصۂ خواب میں رہنا ہے کہ لوٹ آنا ہے
فیصلہ کرنے کی اس بار ہے باری اسکی

.....

خوشبو، صد برگ، خود کلامی، کفِ آئینہ اور انکار۔ پروین شاکر نے اپنی بیالیس سالہ زندگی میں یہ پانچ ستارے تخلیق کیے، جو ان کے چاہنے والوں کے لیے ادبی خزانے کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان یادگار کتابوں کا ایک مجموعہ ماہ تمام، کے نام سے دستیاب ہے۔ ان کے آخری مجموعہ انکار" میں ان کی ابتدائی شاعری کا فرق صاف ظاہر ہے، جو ان کے اس دور کی شاعری کو بے حد نکھار بخش رہا ہے۔ اس میں اشعار کی پختگی اور لہجے کی سختی واضح ہے:

لو چراغوں کی بجھانے سے ذرا پہلے
مرے سردار کا اندازۂ جنگ اور ہی تھا

.....

بھلا کے وہ ہمیں حیران ہے تو کیا کہ ابھی
اسی طرح کا ہمیں بھی کمال کرنا ہے

.....

وزیر و شاہ بھی حسن و خانوں سے نکل آتے
اگر گماں میں انکار قبر آ جاتا

.....

کوئی قاتل کو قتل کے آداب سکھائے
دستار کے ہوتے ہوئے سر کاٹ رہا ہے

.....

26 دسمبر 1994 کو حادثاتی موت کا شکار ہونے والی پروین شاکر آج بھی قارئین کے دلوں میں زندہ ہے۔ آخر میں انہی کا شعر جو ان کی موت پر صادق آتا ہے:

آندھی کی زد میں آئے ہوئے پھول کی طرح
میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کے فضا میں بکھر گئی

☆☆☆☆☆

منشی انعام

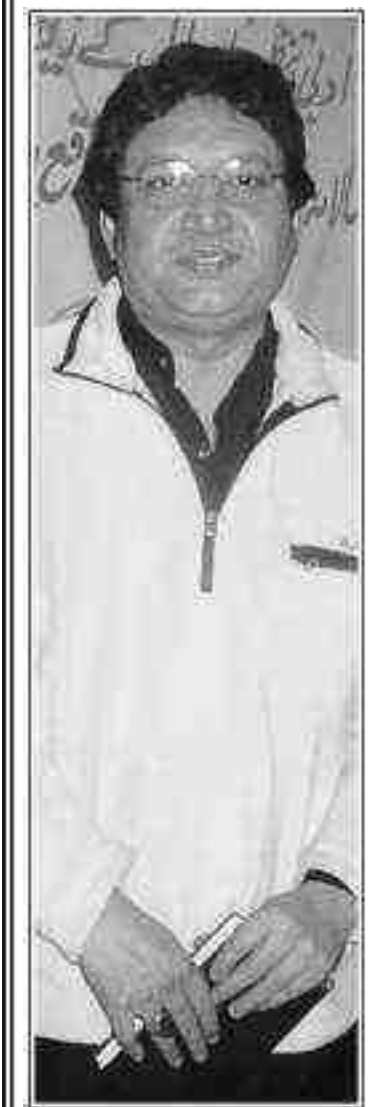

واجد امیر

ہمارا بچپن کا دوست انور کمال عرف چندا تھوڑا بہت حافظِ قرآن تو تھا ہی ساتھ ساتھ نعت خوان بھی تھا ہم پہلی جماعت سے اکٹھے پڑھتے تھے اس کے والد اور والدہ دونوں نابینا تھے ہمارے گھر بھی پاس پاس تھے یعنی ہماری پُرانی حویلی کا جو حصہ سڑک کو لگتا تھا اسی کی سامنے والی گلی میں چندا کا گھر تھا ہم دونوں کا دوستانہ تھا بھی بہت پکا حالانکہ پانچویں جماعت کے بعد ہم دونوں الگ الگ سکولوں میں پڑھتے تھے مگر شام میں اکٹھے ہو جاتے، پھر چندا ہی کی بدولت ہمارے کان سُر سے آشنا ہوئے، شاعری دل کو بھانے لگی شاعری کی طرف آنے کا سبب بھی کسی حد تک گھر کی فضا اور چندا کے ساتھ سنے گئے اشعار تھے جن سے شعروسخن سے لگاؤ ہوا۔ چندا کے گھر کا ماحول چونکہ ہمارے گھر سے زیادہ مذہبی تھا اور اس کے والد حافظ عبدالسلام تراویح میں قرآن سناتے تھے یا سامع کے طور پہ تراویح میں موجود ہوتے اور چندا کے والدین بچوں کو قرآن بھی پڑھایا کرتے تھے حافظ جی نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد میں سلام بھی پڑھتے تھے یہی سب چیزیں چندا میں بھی بدرجہ اتم موجود تھیں وہ قرآن تو حفظ نہ کرسکا شاید کچھ

پارے رہ گئے تھے یا ہو سکتا ہے مکمل ہو گیا ہو ہمیں اس کی مستند خبر نہ مل سکی مگر نعت خوانی میں بہت بہتر تھا۔

خیر جب ہم بہت کم عمری میں چندا کے گھر نعتیں پڑھتے تھے بلکہ نعتیں پڑھنے والوں کی نقالی کرتے تھے تو حافظ جی کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے مسکرایا کرتے تھے کبھی کبھی ہمیں سمجھاتے اور کبھی کبھار ڈانٹ دیا کرتے تھے ایک بار ہم نے کوئی قوالی سنی جو بہت دل کو بھائی یہ کلام حضرت حُسین اور کربلا کے متعلق تھا اس میں قوالوں نے گرہ لگائی تھی کہ:

یہ وفا جفا کے مقابلے تھے حُسین تنہا کھڑے ہوئے
لے سنبھال اپنی امانتیں مرے سر سے قرضہ اُتر گیا

.....

جیسے بدخبرے قوال تھے ویسے لکھنے والے تھے ہم نادان تھے ہمیں ان اشعار کا کیا پتا ہم تو بس لہک لہک کے گا رہے تھے مگر جب ہمارے سُر اور لے بلند ہوئے اور لفظی تکرار بڑھی تو حافظ جی اُٹھ کے آ گئے اور کہنے لگے یہ کیا بکواس گا رہے ہو کیا حسین اللہ تعالیٰ سے ایسے کہہ سکتے تھے؟ کہ، لے سنبھال اپنی امانتیں میرے سر سے قرضہ اتر گیا؟

اُن کی ڈانٹ ڈپٹ سے ہمارے سُر اندر ہی اندر گھٹ کے رہ گئے مگر چندا کو اپنے ابا کی بات بھلی نہیں لگی کہنے لگا ابا دیوبندیوں والی بات کر رہے ہیں حافظ جی حالانکہ بریلوی مسلک سے تھے۔۔ مقصد اس بات کا یہ ہے کہ شعر کہنے والے کو بھی بات سوچ سمجھ کے کرنی چاہیے اور گانے والوں کو بھی اس کا التزام رکھنا چاہیے یہ وہ تنبیہ اور روک تھام تھی، وہ زکاوٹیں تھیں، وہ پیریئر تھے، جنہیں ہم نے اپنے لیے خود اختیار کیا اور جب خود شعر کہے تو حتی الوسع اس دائرے کے اندر رہنے کی کوشش کی۔

مگر چندا نے نعت و سلام منقبت کے معاملے میں بہت کم احتیاط کی۔ ہم تو خیر اس زمانے میں اس قابل تھے ہی نہیں کہ کچھ لکھ سکتے البتہ ایسا تھا کہ جب ہم عید میلاد النبیؐ کو جلوس میں بزم گلشن مدینہ کی ٹرالی کے لیے اپنی ٹولی کے ہمراہ ہارمونیم اور ڈھولکی پہ دھنیں تیار کر رہے تھے تب نئے کلام کی ضرورت محسوس ہوئی سو منتخب کردہ اور اس زمانے کے مشہور گانوں کی طرزوں پہ جب ہمیں مامور کیا گیا تو ہم نعتیں لکھ لائے جنہیں اس زمانے میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اچھا ہی ہوا کہ ان تمام گیت نما نعتوں کو ہم نے بھی فراموش کر دیا اور وقت نے بھی۔ اسکی تو ہمارے فرشتوں کی خبر نہ تھی کہ ہم آگے چل کے شاعری کریں گے۔

چونکہ ہم اور چندا مختلف مساجد کی محافل میں شریک ہوتے تھے سو مسجد الکوثر (جس کا پہلے نام مہاجرین مسجد تھا) میں کسی شب برأت کی محفل میلاد و نعت خوانی میں ہم دونوں نعت پڑھ رہے تھے جب ہم اور چندا

نعت پڑھ کے اپنی نشستوں پہ واپس آئے تبھی ہمارے کان کے قریب کسی کی سرگوشی سنائی دی: کہ ابے یہ فرعون کے گھر موسیٰ کہاں سے آگیا؟

ہم نے جو مڑ کے دیکھا تو ایک عمر رسیدہ شخص کو اپنے قریب پایا۔ ہم نے پوچھا! آپ نے ہم سے کچھ فرمایا؟ کہنے لگے ابے بیٹا تمہارے خاندان میں تو یہ نعتیں پڑھنے پڑھانے کا رجحان نہیں ہے تم اس طرف کیسے آگئے؟ اتنی دیر میں ان کا نام پکارا گیا اور وہ پڑھنے چلے گئے۔

یہ منشی انعام سے پہلی ملاقات تھی انعام صاحب کا حلیہ کچھ عجیب سا تھا، پست قد، آنکھیں بے ترتیب بھی اور ان سے متواتر پانی بہتا رہتا، سیاہ خستہ جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی کرا کلی ٹوپی، منہ کھولیں تو اگلے کچھ دانت ندارد اور مسوڑھے سامنے دکھائی دیتے، بات کریں تو منہ کا زاویہ بگڑ جائے، چلیں تو زمین کے ناہموار ہونے کا شبہ ہو، بولیں تو آواز میں خراشیں پڑیں، بلکہ آواز سخت پھٹی ہوئی کہیں تو زیادہ موزوں ہو، بلا وجہ منہ چلانے کی عادت، مستقل گالیوں کی مناسب تعداد گفتگو کا حصہ، ہر بات ،،ابے،، سے شروع ہوتی، اشعار بے شمار یاد، ابے ہاں تکیہ کلام تھا۔ جب نعت پہ گرہیں لگاتے تو اصل نعت نجانے کہاں رہ جاتی۔

انعام صاحب کو بے شمار اشعار کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے قصے ازبر تھے، افسوس کہ ہم نے یاد نہیں رکھے۔ منشی انعام سے بعد میں مکمل تعارف تب ہوا جب ہم محفل کے بعد آخری اسٹاپ علی احمد کے ہوٹل پہ چائے پینے کے لیے بیٹھے۔ چندا کے پاس نعت پڑھنے کے بعد اچھے خاصے پیسے تھے اور وہ انہیں خرچ کرنے کو تیار تھا چائے پیتے پیتے جو تعارف ہوا تو جانا منشی انعام دراصل ہمارے ماموں عمر کے دوست رہے ہیں یہ لوگ اکٹھے ماہ رمضان میں ٹولی اُٹھایا کرتے تھے شاید اس ٹولی کا ذکر پہلے بھی کسی جگہ آچکا ہے نہیں تو پھر کر لیں گے ابھی تو انعام صاحب کی بات چل رہی ہے تو انعام صاحب کے بقول ہمارے ددھیال اس معاملے میں سخت واقع ہوئی ہیں مگر ہمیں اس میں کوئی صداقت نہیں لگی کہ ہمارے گھر میں وہ خواتین جن کی آواز اچھی تھی وہ نعتیں پڑھتی تھی ہماری پھپھی جو نعت پڑھتی تھیں اس کے الفاظ ابھی تک ہمارے کانوں اور دل کے نہاں خانوں میں محفوظ ہیں کہ۔ سبز گنبد کے مکیں میری مدد فرمایئے،۔۔۔

اس کے علاوہ خود اباجی نے ہمیں بتایا کہ پاکستان بننے سے بہت پہلے ایک دن ابا جی (دادا) ایک ریکارڈ خرید کے لائے جسے بارہا سنا کرتے تھے یہ شمشاد بیگم کی وہ نعت تھی۔۔ ”پیغام صبا لائی ہے گلزارِ نبی سے ۔۔۔ آیا ہے بلاوہ مجھے دربارِ نبی سے۔“

خیر بات ہو رہی تھی انعام صاحب کی۔۔ تو اس کے بعد انعام صاحب سے ایسا تعلق جڑا جو ۱۹۸۶ تک رہا۔ ہمارا تعلق شعر کے حوالے سے تھا جبکہ چندا کا نعت خوانی سے سو ہماری خوب جمتی، جب بھی ملاقات ہوتی۔

انعام صاحب کی زیادہ تر شاعری مذہبی رنگ میں رنگی تھی وہ نعت کہتے تھے اُنہوں نے کئی ایک منقبتیں کہہ رکھی تھیں جن میں موقع کی مناسبت سے اس میں ردوبدل کر لیتے تھے۔

جیسا کے ایک مرتبہ ہم اور چندا ایک ایسے جلسے میں گئے جہاں ہماری مسجد کے امام صاحب لے گئے تھے اور جہاں اصحاب رسول کی مدح سرائی کی جارہی تھی انعام صاحب ہمارے ساتھ تھے ایک عجیب بات تھی اُس زمانے میں نہ ٹیلی فون تھا نہ موبائل نہ کوئی اور ذرائع مواصلات تھے پھر بھی لوگ کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے ٹکرا ہی جاتے تھے جب کسی سے ملنے کو دل کرتا تو یا دروازے پہ دستک ہو جاتی یا کسی گلی میں مڈبھیڑ ہو جاتی، یہی معاملہ اس وقت بھی منشی انعام سے ملاقات کا ہوا۔

یہیں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جن کا نام قربان نظامی تھا اونچی سے ٹوپی جو اس سے پہلے کبھی دیکھی نہ تھی گول چہرہ، روشن آنکھیں، بدن فربہ توند نکلتی ہوئی آنکھوں میں سرمہ، منہ سے پان کی دھاریں باچھوں سے گزرتی ہوئی صاف دکھائی دیتیں، داڑھی صرف تھوڑی پہ جیسی ملا نصیر الدین کی ہوتی ہے، آواز پاٹ دار، گھن گرج والی، یہ تھے قربان نظامی۔ جو کہ شاعر تھے اور وہ بھی نعت گو، بلکہ مدحتِ اصحاب نبی میں انہوں نے اشعار بھی پڑھے۔ انعام صاحب اور قربان نظامی کی آپس میں شناسائی بھی تھی ہم جلسہ کے اختتام پہ اکٹھے نکلے ان دونوں حضرات کے پاس سائکلیں تھیں ہم پیدل تھے سو پیدل چلتے رہے جب برکت علی اسلامیہ ہال سے فرنیچر مارکیٹ سے ہوتے ہوئے نسبت روڈ پہنچے تو سڑک پہ جہاں کبھی مرحوم مظفر علی شمسی صاحب کا گھر تھا وہاں مجلس ہو رہی تھی ساری سڑک پہ قناتیں لگی تھیں۔ ان دونوں حضرات نے آپس میں مسکوٹیں کیں پھر یہ دونوں اصحاب اس مجلس کے منتظمین کے پاس گئے اور انہیں مجلس میں حصہ لینے کی درخواست کی جو ان دونوں اصحاب کے سُنی العقیدہ ہونے کی بنا پہ قبول کی گئی انعام صاحب نے اپنی پھٹی آواز میں مترنم اور قربان نظامی نے زوردار تحت اللفظ میں خوب سماں باندھا۔ میدان نعرہ تکبیر اور نعرۂ حیدری سے گونج اُٹھا اہل تشیوں کو خوش کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ امید واثق ہے کہ دونوں کو نذرانہ بھی پیش کیا گیا ہوگا جس کے بعد تمام راستہ ہم پیدل چلے اور کسی ہوٹل سے چائے بھی پی۔ ہمارے لیے یہ بلکل نیا تجربہ تھا کہ ایک ہی وقت میں مدح

اصحاب میں بھی مہارت رکھنا اور شیعوں پہ بھی اپنے کلام سے اثر انداز ہونا ہمیں حد درجہ حیران کر گیا۔

منشی انعام سے وہ قصے سننے کا مزہ آتا تھا جب نیا نیا پاکستان بنا تھا اور سب لاہور کی گلیوں میں بے فکر پھرا کرتے تھے اُن لوگوں کو رونما ہونے والی تبدیلوں پہ بہت افسوس ہوتا تھا یہ جب کی بات ہے جب سڑکوں پہ اکا دکا کار ایک آدھ موٹر سائکل چند ایک سائکل، تانگے بیل گاڑیاں تھیں اگر وہی لوگ جو دنیا چھوڑ گئے اب اس عہد کے لاہور کو دیکھ لیں تو پھر مر جائیں ہم جو اس نسل سے ہیں جنہوں نے دیے جلتے دیکھے اور اب لیزر لائٹ کا کمال دیکھ رہیں ہماری ہمت کی بھی داد تو بنتی ہے۔

انعام صاحب نے بتایا کہ ایک مرتبہ چھوٹا صالح قوال کے گھر کراچی گئے جب انہیں اسنے اپنے کمرے میں بٹھایا اور اپنی بیگم کو بتایا کہ انعام صاحب آئے ہیں اور خاتونِ خانہ نے انعام صاحب کی شان میں انتہائی گستاخانہ جملے اور نازیبا الفاظ کہے تو انعام صاحب کہتے ہیں میں چپکے سے سیڑھیاں اتر کے نکل آیا۔

وہ شعر ہے ناں شوکت فہمی کا۔۔۔

اس نے پوچھا کہ کون فہمی کون
اور میں سیڑھیاں اتر آیا

.....

انعام صاحب کے سامنے ہم نے کبھی شاعری کا بتایا ہی نہیں بس ان سے اشعار سنتے تھے انعام صاحب کسی وکیل کے منشی تھے اب وکیل کا منشی ہونا کوئی معمولی بات تو ہے نہیں! جتنا قانون اور زمانہ شناسی وکیل کے پاس ہوتی ہے اتنی ہی منشی کے پاس ہوتی ہے انعام صاحب ہمارے گھر کم ہی آواز دیتے غالباً ہمارے خاندان سے کتراتے تھے البتہ چندا کے گھر جا کے اسے مل لیتے اور حافظ جی سے بھی گپ شپ لگا لیے۔ ہم نے اپنے ماموں سے جب انعام صاحب کا ذکر کیا تو خوش ہوئے اور اپنی بے تکلفانہ دوستی کا برملا اظہار کیا۔۔

وہ نو محرم کی شام تھی کرشن نگر پانڈو سٹریٹ سے نکلنے والا ذوالجناح کا جلوس ابھی خیمہ سادات سے نکل کے دوبارہ اسلام پورہ کی سڑکوں پہ رواں دواں تھا ہم اور چندا حسب معمول اس ذوالجناح کے الوداعی لمحوں کے بعد گھر جانا چاہتے تھے تب ہی انعام صاحب آ گئے۔ انعام صاحب ہمیشہ کسی بغلی گلی سے برآمد ہوتے یا عقب سے آ کے چپکے سے کہہ دیتے ،،کیا ہو رہا ہے،، ہمارا وہی ڈائلاگ ہوتا آپ کب آئے؟ جس پہ وہ کہتے کبھی کا آ گیا تھا تمہارے کام دیکھ رہا تھا۔ ہمیں اور چندا کو انعام صاحب کے آنے کی خوشی ہوتی تھی سو آج بھی ہوئی۔

آج جب انعام صاحب آئے تو کہنے لگے ،،اے عزیز میاں کے گھر چلتے ہیں،، ہم اس

اچانک پروگرام سے حیران ہو گئے یہی حال چندا کا تھا پوچھا گیا وہ کیوں؟ انعام صاحب بولے! ارے ہاں! بلایا ہے اس نے، اس کے گھر شب بیداری ہے۔ چلتے ہیں، تعزیہ بنا کے بیٹھا ہے۔ ہمیں جانے میں تامل نہیں تھا بس ذوالجناح ہماری سڑک تک آنے والا تھا اسی شش و پنج میں تھے کہ انعام صاحب بولے ارے کس سوچ میں پڑ گئے؟ چلو۔

چندا اور ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور چلنے کی حامی بھر لی۔

عزیز میاں قوال سے تھوڑی سی شناسائی تھی چونکہ کرشن نگر کے ہی تھے ہندو ہوسٹل کے رہائشی تھے اور ان کا نام چار دانگ عالم میں گونج رہا تھا ان دنوں اپنا نیا گھر بنا کے اسلام پورہ ہی میں ایک نئی آبادی میجسٹک ٹاؤن میں چینی ہائی سکول کے قریب رہائش پذیر تھے ہم نے انہیں بارہا قوالی اور پانڈو سٹریٹ کے عزاخانے کے باہر گلیوں میں مجلس سنتے دیکھا تھا۔

ہم انعام صاحب کے ساتھ جب عزیز میاں کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ عزیز میاں کے گھر کے چھوٹے سے صحن میں تعزیہ رکھا ہوا تھا منشی انعام نے ایک شخص سے کہا ارے سن! وہ کہنے لگا مجھ سے کچھ کہا؟ منشی انعام کہنے لگے ہاں میاں تم سے ہی کہا عزیز میاں سے کہو انعام صاحب آئے ہیں! اگربتیوں کی خوشبو چار سو پھیلی ہوئی تھی اس چھوٹی سی ضریح پہ کچھ عورتیں منتیں مان کر چڑھاوے چڑھا رہی تھیں۔

منشی انعام کی پاٹ دار چیختی آواز نے وہاں موجود بچوں کو اپنی طرف متوجہ کیا: کہاں ہیں عزیز میاں؟ کچھ ہی دیر گزری کہ عزیز میاں جھومتے جھامتے سامنے کے برآمدے سے برآمد ہوئے اور اپنی چیختی آواز میں دوسری چیختی آواز سے مخاطب ہوئے آہا انعام صاحب، ارے آؤ بھی آؤ، آؤ۔۔ یہ آؤ آؤ چل رہی تھی کہ ہم بھی اس میں داخل ہو گئے عزیز میاں نے ہم دونوں کو بھی خوش آمدید کہا اور ہم سب تعزیہ کے عقب میں بچھی چاندنی پہ بیٹھ گئے۔۔

پھر دیسی گھی کا قورمہ اور زردہ بھی سامنے آ گیا جس کے ساتھ انصاف کیا سب نے۔۔ بس پھر اس کے بعد صبح تک باتیں چلیں اشعار سنائے گئے سنے گئے عزیز میاں کو فارسی اشعار بہت یاد تھے جو انہوں نے سنائے ایک شعر اپنے موضوع کے ساتھ بہت سے شعر کھینچ لاتا۔ پتہ ہی نہیں چلا کب رات بیت گئی۔ اس رات یہ بات (مرحوم) عزیز میاں نے بتائی کہ میاں شعر وارد ہو جاتا ہے ان کے کہنے کے مطابق گول باغ سے گزرتے ہوئے جب وہ ایک فارسی کا شعر گنگنا رہے تھے جس کا مفہوم کسی مستقبل کے بارے میں کوئی بڑی پیشن گوئی پہ تھا تب ہی کہیں سے اچانک کوئی بزرگ نکل کے

سامنے آئے اور انہوں نے اس کے متعلق منع کیا کہ اگر ایسا ہو گیا تو کیا کرو گے؟

یہ بھی عزیز میاں کی زبانی سنا کہ بچپن میں ایک استاد طبلہ نواز جب انہیں ریاض کروا رہے تھے تو طبلہ نواز استاد نے انہیں پان لینے بازار بھیجا عزیز میاں کہنے لگے ہم طبلے کے بول پختہ کرتے ہوئے بازار تک گئے گھر آئے تو پاؤں سم پہ تھا۔

ہم تو بہت متاثر ہوئے مگر منشی انعام کے چہرے سے بے یقینی اور تمسخر نمایاں تھا واپسی پہ ہم نے انعام صاحب سے پوچھا طبلے والی بات پہ آپ مسکرائے کیوں؟ بولے بے تالہ ہے۔ پھر بھی یہ ایک یادگار محفل تھی ساری رات چائے بن بن کے آتی رہی عزیز میاں چمکیلے سیاہ کرتے پہ سالن گراتے اور بچوں کو گود میں اٹھاتے رہے دامن کے داغ اپنی بہار دکھاتے رہے۔ یہ بھی اسی رات پتہ چلا کہ عزیز میاں منشی انعام سے قد میں کم ہی تھا۔ اس رات امیر خسرو، اقبال، جگر، غالب، میر، قمر جلالوی، بیماب اکبر آبادی اور جانے کس کس کے اشعار دھرائے گئے عزیز میاں جیسا سخن فہم، شعر شناس، اور یادداشت والا قوال کم ہی دیکھنے میں ملا۔

یہیں رنگیلا راگی سے بھی ملاقات ہوئی رنگیلا عزیز میاں کا شاگرد تھا شاید اس کے آگے پیچھے کوئی تھا بھی نہیں اور اگر تھا بھی تو لاہور میں نہیں تھا رنگیلا عزیز میاں کی بہت خدمت کرتا تھا۔

عزیز میاں کے بچے وہیں ٹی میں لوٹ پوٹ ہو رہے تھے بیگم عزیز میاں (یہ پہلی بیگم تھیں) وہیں پھرتی دکھائی دیں۔ جب صبح کی اذانیں بلند ہوئیں تو ہم اپنے گھروں کو لوٹے۔

ہماری ناپختہ شاعری ابھی انعام صاحب کو سنانے کا وقت نہیں آیا تھا اگر کبھی اپنی جدید شاعری کو ایک آدھ نمونہ سناتے تو ارشاد ہوتا! ابے ہاں ٹھیک ہے۔ وہی شاعری جب ہم کسی گمنام شاعر کے نام سے سناتے تو داد ملتی۔ انعام صاحب اور چندا کی خوب بنی۔

یہ جب بھی کسی نعت کی محفل سے بھری جیبیں لیے آتے تو ہم آخری اسٹاپ پہ کبھی علی احمد اور کبھی رئیس کے ہوٹل پہ چائے پیتے منشی انعام سے ملاقاتوں کا سلسلہ ہماری شادی کے بعد تک جاری رہا ہمیں انعام صاحب کے گھر کا کچھ پتہ ہی نہ تھا تو انہیں دعوت کیسے دیتے شادی کے بعد انہیں چندہ ملا جس نے انہیں ہماری شادی کا بتایا جس پہ ناراض ہو گئے کہنے لگے تو نے مجھے شادی پہ کیوں نہیں بلایا ہم نے گھر کو پتہ نہ ہونے کو عذر پیش کیا تو چپ ہو گئے۔ اس کے بعد ایک دو ملاقاتیں سر راہ ہوئیں پھر نجانے منشی انعام کہاں غائب ہو گئے کبھی کبھی لگتا ہے کہ منشی انعام کہیں نہ کہیں سے نکل کے آئیں گے اور کہیں گے، ابے سنا کیا چل رہا ہے آج کل؟ چائے تو پلا۔

☆☆☆☆☆

عجیب تر ہیں بہت آنکھ کے فسانے بھی [طنز و مزاح]

استاد یاری خان اپنی پوری آب وتاب اور توانائیوں سمیت آج ایک بار پھر میرے سامنے موجود تھے؛ حسب معمول ایک بالکل نئے موضوع اور نرالے منطقوں کے ساتھ۔ دس نمبر کی عینک کے پیچھے اپنے گول گول دیدے مٹکاتے ہوئے، جس میں آنکھوں کے اندر سرخ ڈورے تک صاف نظر آرہے تھے۔ یاری خان نے پہلو بدلتے ہوئے گلا صاف کیا اور گویا ہوئے، "آنکھوں کی اہمیت کسی اندھے سے پوچھیں۔ آنکھ ہی ہماری جسم کا وہ عضوِ ضروری ہے جس کی بدولت ہماری دنیا میں اجالا ہے اور یہی وہ لفظ ہے جسکے بھرپور استعمال سے ہم صاحبان بست وکشاد نے ادب کا دامن بھی روشنیوں سے بھر دیا ہے۔ جس طرح زندگی میں ہم آنکھوں سے بھرپور کام لیتے آئے ہیں اسی طرح ادب میں بھی ہم نے اسے قسم قسم کے طریقوں سے استعمال کرکے اپنی مہارت کا بین ثبوت پیش کیا ہے"۔ وہ اس وقت مدلل بحث کے موڈ میں تھے اور میں چاروناچار اس کی گفتگو سننے اور اس میں شریک ہونے پر مجبور تھا کیوں کہ میں ہی اکیلا "واحد حاضر" تھا۔ "دیکھو! آنکھیں فقط اس لئے نہیں دی گئیں کہ انہیں بند ہی رکھا جائے، اس کے اور بھی بیسیوں کام ہیں"۔

"آنکھیں کھولنے کے لئے ہمارے رشتہ دار اور یار دوست ہی کافی ہیں؛ وہ موقع بہ موقع ہماری آنکھیں کھولتے ہی رہتے ہیں۔ ہمارے پاکستان میں ہر نئی بننے والی حکومت بھی یہ فریضہ بطریق احسن انجام دیتی رہتی ہے"۔ میں نے لقمہ دینا مناسب سمجھا۔

فوراً" پوچھ بیٹھے، "صرف نئی حکومت ہی کیوں.....؟؟

"کیوں کہ اس کے بعد ہمیں اس کی عادت

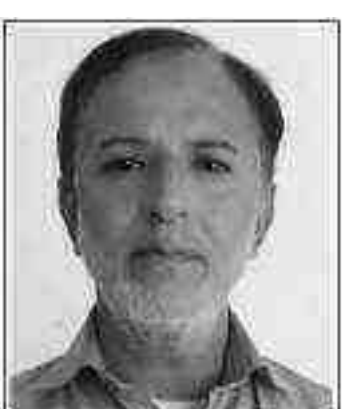

نور کمال شاہ

ہو جاتی ہے..... !! "- میں نے جواب دیا -

- میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اپنا بیان جاری رکھا- "اب ذرا دیکھ! ہمارے صاحبان علم و دانش کتنی مہارت سے آنکھوں کا استعمال کرتے ہیں: ذرا سی کوتاہی ہوئی اور تنبیہ مل گئی " ذرا آنکھیں کھول کے دیکھ! دھیان کدھر ہے تیرا- "کام سے توجہ ہٹی اور حکم آیا" ادھر ادھر کیا آنکھیں گھما رہا ہے، اپنی کام پہ توجہ دے - "یاران باصفا کی محفل میں جا کر بیٹھے تو فوراً پوچھا گیا،" کیوں بھائی شہزادے کہاں ہوتا ہے آج کل: نظر ہی نہیں آتا؛ کہیں آنکھ وانکھ تو نہیں لڑائی نہ....."- دور سے کسی مائی کی دہائی سنائی دیتی ہے، "ہائے اللہ..! اتنا ظلم، اللہ کرے اس کی آنکھیں پھوٹ جائیں..."-

- " آپ کا مطلب ہے کہ ہم لوگ آنکھ کی چوکھٹ پر دھونی رما کے بیٹھ گئے ہیں؟؟ " میں نے وضاحت چاہی- سنی ان سنی کرتے ہوئے کہنے لگے -" آگے سنو! بازار میں سے گزرتے ہوئے بچا پہلوان کی گرج سنائی دیتی ہے:" حرام خور! اب جو تم اس کام سے باز نہ آئے تو آنکھیں نکال دوں گا ---- " غالب مرحوم جسمانی توانائی کھونے کے باوجود آنکھوں کے زور پر عیش و نشاط کے رسیا اور تمنائی نکلے، جب ہی تو ساقی کو پکار پکار کر سامنے سے دور ہونے اور ساغر و مینا کو ہاتھ تک نہ لگانے کی درخواست کر رہے ہیں،

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

.....

ایسے میں کہیں دور سے مہناز کی آواز کانوں میں گونجنے لگتی ہے،

"آنکھیں بڑی پاگل ہیں.....
ہر بات بتاتی ہیں.....

..... وہ دم لینے کو ذرا رکے، سامنے پڑی تازہ چلم سے ایک لمبا کش لگایا اور ہلکی سی کھانسی کے ساتھ دھواں اوپر ہوا میں چھوڑتے ہوئے باتوں کا سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے چھوڑا تھا اور اگلی قسط سنانی شروع کر دی-

-"دوکان دار گاہک کو دھتکارتے ہوئے گویا ہوتا ہے-" مجھے آنکھیں مت دکھاؤ - نہیں لینا تو اپنا راستہ ناپو "-

اسی طرح یہ جملہ بھی بارہا آپ نے سنا ہوگا - " آنکھیں مت نکالو ؛ میں کچھ کرتا ہوں"- سخت گیر قسم کے بزرگ اور بعض اساتذہ بھی اپنے بچوں کو تادیب سکھانے کے لئے اس قسم کے جملے اکثر استعمال کرتے ہیں-" دیکھو! میں ہر وقت زبانی

تاکید کے حق میں نہیں ہوں، میری آنکھ کے اشارے کو ہی کافی سمجھا کرو"۔ ایسے ہی وقت میں کسی جوشیلے شاعر کی غزل میں کوئی سرپھرا عاشق محبوب کی نشیلی آنکھوں کے جام پینے کی خاطر اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر دیتا ہے۔ دور کسی باغ کے گوشے میں ایک ناکام عاشق جھوٹ موٹ کے آنسو بہاتے ہوئے، اپنی رخصت ہونے والی محبوبہ کو بے وفائی کا طعنہ دیتے ہوئے کہنے لگتا ہے۔ "میں نے تو سوچا تھا تم عمر بھر ساتھ نبھاؤ گی؛ اتنی جلدی آنکھیں بدل لیں تم نے"۔ پس منظر میں اسد امانت علی خان عالم کیف میں پکار اٹھتے ہیں......

آنکھیں غزل ہیں آپ کی، اور ہونٹ ہیں گلاب
سارے جہاں میں آپ کا، کوئی نہیں جواب

......

بیگم غصے میں آئے شوہر نامدار کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے گرجتی ہے۔ "مجھ پہ آنکھیں نہ نکالیں جی، ذرا اپنے کرتوت بھی دیکھ لیں۔" جوش میں آیا ہوا عاشق معشوق کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پکار اٹھتا ہے۔ "میں تمہاری ان گہری آنکھوں کے سمندر میں ہمیشہ کے لئے ڈوب جانا چاہتا ہوں، فنا ہونا چاہتا ہوں"۔

"تم بالواسطہ کہیں یہ ثابت کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہے کہ ہماری زبان و ادب میں آنکھوں کے سوا کچھ ہے ہی نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں کیا ثابت کروں گا، خود دیکھ کر فیصلہ کرو۔ ہمارے شاعر و ادیب اور ساتھ ساتھ ادبی و اشاعتی ادارے بھی پچھلے تین، ساڑھے تین صدیوں میں جسم کے حدود سے باہر نکل ہی نہیں سکے ہیں؛ وہی دل، دماغ، جگر، آنکھ و زلف، لب و رخسار کا نوحہ آج بھی دہرایا جا رہا ہے اور نئی نسل کو دیوانہ بنایا جا رہا ہے۔" ان کے پاس جواب تیار تھا۔

"اس طرح تو تم ان حضرات سے اور خصوصاً صاحبان فہم و فراست سے بلا قیمت دشمنی نہیں مول رہے؟"۔ میں نے پوچھا۔ کہنے لگے "کون سے صاحبان علم کی بات کرتے ہو؟؛ جب تک آپ پہ صنف نازک کا گمان نہ ہو یا کسی کاروباری مفاد کا یقین نہ ہو، اس وقت تک یہ صاحبان آپ سے تمیز سے بات کرنا بھی پسند نہیں کریں گے؛ میں نے اس میدان میں بہت دھوکے اور دھکے کھائے ہیں"۔

"یہ فریب ہمیشہ تمہارے ساتھ ہی کیوں کیا جاتا ہے، کیا دوسرے لوگ سارے دانا اور ہوشیار ہیں"۔ میں نے ہمدردی جتاتے ہوئے پوچھا تو کہنے لگے، "صرف میری

بات نہیں، دھوکے، دھکا اور مفت کا کھانا کسی سے بھی اور کسی بھی وقت کھایا جا سکتا ہے؛ انور مسعود لکھتے ہیں، ہم پاکستانیوں کو جب تک دھوکے اور کھوتے کا پتہ چلتا ہے، ہم اسے کھا چکے ہوتے ہیں- کیا دھوکہ اور کھوتا کھانے کے لیے پاکستانی ہونا ضروری ہے؛ کیا گڑ کھانے والا بندہ لازمی طور پہ چارسدے یا مردان کا ہونا چاہیے- یا نسوار کھانے والا گل خان اور پٹھان ہی ہونا لازمی ہے؟؟؟"

مزید بولے: "پلیٹ میں کچالو کے پیچھے گھوڑے دوڑانے سے بہتر ہے کہ شوربے پہ گزارہ کیا جائے-" آنسو رکھنے اور بہانے کے لیے آنکھ سے بہتر پیالہ ہو ہی نہیں سکتا کیوں کہ یہ کام، ناک یا کان سے کیا ہی نہیں جا سکتا؛ دوست اور دشمن میں تمیز کے لئے بھی اس عضو کو استعمال کیا جا سکتا ہے؛ یعنی آنکھیں کھول کر کسی کی اصلیت جانچی جا سکتی ہے تو آنکھیں بند کر کے کسی پہ اعتماد بھی کیا جا سکتا ہے- اپنے اور اپنے عزیز و اقارب کے درمیان معاشرتی و معاشی فرق یعنی فرق مراتب نوٹ کرنے کے لیے بھی اس کا استعمال جائز ہے- شرح آرزو کے لئے بھی زبان غیر سے زیادہ آنکھیں ہی اہم اور ضروری ہیں-"

"اور اگر ہم اس ساری بحث کے نچوڑ پہ آجائیں تو؟؟ میں نے پوچھا تو فرمانے لگے "بہت ہی سادہ اور نہایت آسان نچوڑ- پتہ ہے ہمارا المیہ کیا ہے؟ ہمیں جہاں آنکھیں کھلی رکھنی ہوں وہاں جان بوجھ کر انھیں بند رکھتے ہیں اور جہاں بند رکھنی ہوں وہاں کھول کے رکھتے ہیں- ہم فقط آنکھوں کے اندھے نہیں بلکہ دماغ کے بھی کورے ہیں؛ جبھی تو ہماری دیواروں پر عجیب و غریب قسم کے اشتہاروں کی بھرمار ہوتی ہے؛ ایک رات میں بی اے پاس کریں؛ گھڑیوں کا ہسپتال، ڈاکٹر لقمان ہیئر ڈریسر یا سنگدل محبوب آپ کے قدموں میں؛ وگرنہ اللہ گواہ ہے کہ یہ سب ایسے ناممکنات ہیں جیسے دن میں تارے نظر آنا"-

ممکن ہے یہ بحث طویل ہو جاتی مگر تھوڑی کھجاتے ہوئے اچانک ان کی نظر دیوار پہ لگی گھڑی سے جا ٹکرائی- چنانچہ بحث کو لپیٹتے ہوئے فوراً ہی اٹھ بیٹھے- اصل میں آج انھیں ایک قرض خواہ کو پکڑنے اور رگڑنے جانا تھا اس لئے باقی ماندہ چائے کو ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اتار کر آئندہ نشست تک رخصت چاہی- رکشے کا کرایہ مجھ سے وصول کرنے کے فوراً بعد وہ روانہ ہوئے- میں نے ایک گہری سانس لی اور دماغ کی تھکن اتارنے کے لئے آنکھیں بند کر لیں ---------

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے ملہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق سوہائی سول سروس ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صف اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلک سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو، سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیر طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانح عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

ٹوکیو پھول اور کانٹے: ٹوکیو کا وینڈا ایئرپورٹ مشرق بعید کے مصروف ترین ہوائی اڈوں میں سے ایک ہے۔ جس ملک کی معیشت دنیا میں دوسرے نمبر پر ہو وہاں ساری دنیا کا آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔ میں سامان کی ٹرالی لئے جب کسٹم کاؤنٹر کے قریب پہنچا تو جمگے کا اہلکار ایک لڑکی کا سامان چیک کر رہا تھا۔ جب اس نے ایک بڑے سوٹ کیس کو کھولنے کا کہا تو اس دھان پان سی لڑکی نے اسے ہاتھوں سے اُٹھا کر کاؤنٹر کے اُوپر رکھنے میں دشواری محسوس کی۔ اس نے بے بسی سے افسر کی طرف دیکھا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا "تم

اس کی مدد کیوں نہیں کرتے؟'' مجھ سے چپ نہ رہا گیا۔

''تو تم کر دو'' اس نے خشونت سے میری طرف دیکھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا سوٹ کیس اٹھایا اور کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ لڑکی کا سامان چیک کر کے وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ بولا ''اب تمہاری باری ہے۔'' پندرہ بیس منٹ تک سامان کو اتھل پتھل کرتا رہا۔ جب اس نے بادل نخواستہ چاک سے سامان پر کراس لگایا تو میں ٹرالی دھکیلتا ہوا باہر آ گیا۔

باہر خواجہ طارق صاحب اپنے بچوں کے ساتھ میرا انتظار کر رہے تھے۔ بچوں نے گلاب کے پھولوں کا گلدستہ اٹھا رکھا تھا۔ اکثر پھول کے ساتھ کانٹے ہوتے ہیں۔ پھول اور کانٹوں کا الگ الگ تجربہ پہلی بار ہوا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب سے ملنے کا بھی پہلا موقعہ تھا۔ خواجہ صاحب میاں نذیر (نذیر عنایت اللہ ٹرانسپورٹ کمپنی کے مالک) صاحب کے عزیز تھے اور ان کی وساطت سے میں سات دنوں کے لئے ان کا مہمان تھا۔ ٹوکیو شہر کا شمار دنیا کے مہنگے ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ زبان کا مسئلہ بھی ہے۔ گو میاں شریف کے فرزند کے تجربے نے کچھ محتاط بنا دیا تھا لیکن بحیثیت ایک سفرنامہ نگار کے مجھے اس بات کا علم تھا کہ ہر پاکستانی اس قدر بے مروت نہیں ہوتا۔ اگر بچے پھولوں کا گلدستہ نہ بھی لاتے تو بھی خواجہ صاحب کا خلوص اور مسکراہٹ پھولوں سے کم نہ تھی۔ ان کی بیگم بھی ساتھ تھیں۔ خواجہ صاحب کا ٹوکیو میں قالینوں کا کاروبار تھا۔ کہنے لگے ''بڑی دیر سے انتظار کر رہے تھے۔ آپ آئے تو اپنی مرضی سے ہیں لیکن جانے کی اجازت ہم دیں گے۔'' جب میں نے کسٹم افسر کا واقعہ بتایا تو کہنے لگے کہ محکمے کی اکثریت مہذب اور با اخلاق ہے، اس قسم کی کالی بھیڑیں ہر جگہ ہوتی ہیں۔

ایئر پورٹ شہر سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ راستے میں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سڑک کے دونوں جانب اونچی اونچی دیواریں کھڑی تھیں۔ خواجہ صاحب نے بتایا کہ رہائشی آبادی کو ٹریفک کے شور سے بچانے کے لئے انتظام کیا گیا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں شور بھی ماحولیاتی آلودگی کی ذمرے میں آتا ہے۔ مناسب فاصلوں پر الیکٹرانک بورڈ لگے تھے جو اگلی ٹریفک کا والیوم، مختلف مقامات تک پہنچنے کا وقت اور موسم کا حال بتاتے تھے۔ ٹریفک جام کی صورت میں متبادل راستوں کی نشاندہی بھی کی جاتی تھی۔ اس قدر تفصیلی بندوبست اور کسی شہر میں نہیں دیکھا تھا۔

ہمیں گھر تک پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ راستے میں ایک بیکری کے قریب رکے۔ خواجہ صاحب نے کیک خریدا۔ کہنے لگے بڑے موقع پر آئے ہیں آج بیگم کی سالگرہ ہے۔ خواجہ صاحب کی خوش خوراکی کا اندازہ تو ان کا ڈیل ڈول دیکھ کر ہی ہو گیا تھا لیکن

خوش اخلاقی نے مجھے کیک کا ایک چوتھائی حصہ کھانے پر مجبور کر دیا۔ ہر دفعہ اصرار کر کے ایک اور پیس پلیٹ میں ڈال دیتے اور ہنس کر بیگم کو کہتے ''شاہ صاحب تکلف سے کام لے رہے ہیں۔'' وہ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتیں۔ بتانے لگے ''میاں نواز شریف ایک بار جاپان آئے تھے تو ان سے کھانے پر ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے سومو پہلوان کہتے ہیں۔''

شام کو وہ ایک انڈین ریسٹورنٹ پر لے گئے۔ کہنے لگے ''آپ نے کافی عرصہ سے دیسی کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ اس لئے سوچا کہ شروعات پاکستانی کھانے سے کی جائے۔ میری حیرانی کو بھانپتے ہوئے بتایا پاکستانیوں نے بھی اپنے ریستورانوں پر انڈین فوڈ لکھ رکھا ہے۔ کھانے والوں کی اکثریت غیر ملکیوں کی ہوتی ہے۔ وہ لفظ انڈین فوڈ سے آشنا ہیں۔ پاکستانی فوڈ کے لفظ کا تعارف کرانے میں کچھ وقت لگے گا۔'' کھانے سے پہلے ہم نے شہر کا چکر لگایا۔ بیشتر دکانوں کے نام جاپانی زبان میں لکھے تھے اس لئے باہر سے اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ اندر کیا ہے۔ جب ہم ریسٹورنٹ میں پہنچے تو شام کے 9 بج رہے تھے۔ خواجہ صاحب نے کھانا تھوک کے حساب سے منگوالیا۔

''اتنا کھانا کون کھائے گا؟'' میں نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

بولے ''فکر نہ کریں۔ اتنی خوراک تو میرے بچے کھا جاتے ہیں۔ آخر سومو کی اولاد ہیں پھر کشمیری ہیں۔ آپ نے میاں نواز شریف کے حوالے سے کشمیریوں کی خوش خوراکی کے قصے تو سن رکھے ہوں گے۔''

کھانے میں سٹارٹر کے طور پر پاپڑ اور چٹنی آئے۔ اس کے بعد چکن بریانی، چکن تکے، مٹن کباب، نرگسی کوفتے، بادامی قورمہ کی ڈشیں سرو کی گئیں۔ ان کی اشتہا سے ہی طبیعت سیر ہو گئی۔ یہاں بھی خواجہ صاحب نے کیک والی حکمت عملی اختیار کی۔ کچھ نہ کچھ میری پلیٹ میں ڈال دیتے اور ہنس کر پوچھتے آپ کچھ کھا نہیں رہے ہیں لگتا ہے جہاز میں ایئر ہوسٹسوں نے خوب خاطر مدارات کی ہے۔

جب تھکن اور خوش خوراکی یکجا ہو جائیں تو نیند کی یلغار کو کوئی نہیں روک سکتا۔ گھر آتے ہی سب گھوڑے بیچ مشت بیچ ڈالے اور خواب استراحت کے مزے لوٹنے لگا۔

صبح حسب عادت پانچ بجے آنکھ کھل گئی۔ خواجہ صاحب نے سیر گاہ کی نشاندہی رات کو ہی کر دی تھی۔ باغ گھر کے قریب تھا۔ میں نے جوگر پہنے اور ایک فرلانگ کے فاصلے پر بایاں موڑ کاٹتے ہی باغ میں داخل ہو گیا۔ سارا باغ لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ ہر کوئی ورزش کر رہا تھا۔ اکثریت تو جوگنگ کرنے والوں کی تھی کچھ لوگ ڈنڈ بیٹھک کرتے

ہوئے نظر آئے - بڑے بوڑھے Aerobics کر رہے تھے - میں نے برسک واک پر اکتفا کیا- ایک گھنٹے کی سیر کے بعد جب ہلکی ورزش کرنے لگا تو ایک عجیب منظر دیکھا- پہاڑی کوؤں Ravens میں لڑائی ہو رہی تھی - جس تیزی اور خونخواری سے وہ ایک دوسرے پر حملہ کر رہے تھے- اس نے ایک عجیب طرح کا خوف طاری کر دیا- سوچا اگر یہ کسی انسان پر جھپٹیں تو اس کا حشر نشر ہو جائے- ان کے پر جھڑ رہے تھے لہولہان ہو رہے تھے لیکن ایک دوسرے کو پنجے اور چونچیں مارنے سے باز نہیں آ رہے تھے- میں نے ایک جاپانی سے پوچھا کہ وہ کیوں لڑ رہے ہیں - اسے انگریزی نہیں آتی تھی- اس نے ہاتھ کے اشارے سے کچھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں ٹھیک طرح سے وجہ نزاع نہ جان سکا- وہ سینکڑوں کی تعداد میں تھے- ایسے پتہ چلتا جیسے میزائلیں چل رہی ہیں- حملہ کرتے وقت وہ بڑی عجیب آوازیں نکالتے- میں باغ سے تو کسی طور نکل آیا لیکن خوف کی سرد لہر نے کافی دیر تک میرا پیچھا کیا-

ناشتے کے بعد خواجہ صاحب بادشاہ کا محل دکھانے لے گئے- محل شہر کے اندر ہے لیکن اس اعتبار سے الگ ہے کہ اس کے اردگرد وسیع میدان ہے - انہوں نے مرکزی دروازے سے ہٹ کر گاڑی کھڑی کی- میرا خیال تھا کہ بکنگھم پیلس یا وائٹ ہاؤس کی طرح اندر جانے کی اجازت ہوگی- استفسار پر خواجہ صاحب مسکرائے- کہنے لگے یہ بڑی عجیب قوم ہے- نظر بھر کر اپنے بادشاہ کو نہیں دیکھتی، اندر کون جانے دے گا-

''اس کی وجہ کیا ہے؟''

''کیونکہ بادشاہ ہونے کے باوصف وہ جاپانیوں کے نزدیک انسان سے بالاتر ہے- وہ سربراہ مملکت ہی نہیں بلکہ مملکت ہے اقتدار اعلیٰ کا مظہر ہے- ان کے نزدیک دیوتا ہے اس لئے جاپانی اسے دیکھنے سے اجتناب برتتے ہیں- ملاقات پر بھی نگاہیں نیچی رکھتے ہیں - لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بادشاہ کو دیکھنے سے بصارت متاثر ہوتی ہے- جب بادشاہ سفر کرتا تھا تو راستے میں سب عمارتوں کے شیشے بند ہو جاتے تھے-

''کیا اب بھی ایسا ہے؟'' میں نے پوچھا-

''فرق پڑا ہے- بادشاہ کو انسان کے قریب لانے کی شعوری کوششیں ہوئی ہیں لیکن اب بھی عام جاپانی کا عقیدہ ہے کہ وہ سورج کی اولاد ہے- بادشاہ کے احترام کا یہ عالم ہے کہ ایک دفعہ ایک ٹریفک پولیس مین شاہی قافلے کو غلط راستے پر لے گیا- جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے خودکشی کر لی- اسی طرح ایک مرتبہ چلتے چلتے باڈی گارڈ کا پاؤں شاہ کے لباس کو چھو گیا، اس نے بھی فوراً اپنے آپ کو گولی ماردی-

''کمال ہے! میں نے حیرانگی کا اظہار کیا'' ایک پڑھی لکھی قوم اس قدر قدامت پسند اور

اوہام پرست ہو سکتی ہے۔“

بولے ”یہ ایک ذہنی کیفیت ہے۔ برطانیہ میں بادشاہت کو قائم رکھنے کا کیا جواز ہے لیکن اب بھی ایک عام شخص بادشاہ کی حد سے زیادہ عزت کرتا ہے۔ یہاں ایسا وقت بھی تھا جب ڈاکٹر بادشاہ کے جسم کو علاج کی غرض سے بھی ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے۔ وہ معائنے سے پہلے ہاتھوں پر ریشمی دستانے چڑھاتے۔ درزی دور سے ہی اس کا ماپ لیتا۔

خواجہ صاحب بادشاہت کے متعلق کافی معلومات رکھتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ شاہی خاندان گزشتہ چھبیس سو سال سے جاپان پر حکومت کرتا آ رہا ہے۔ اس طویل عرصے میں کبھی ان کے خلاف بغاوت نہیں ہوئی۔ اس خاندان کی بنیاد آج سے ۲۶۰۲ سال پہلے جمو Jimmu نے رکھی۔ ان کے عقیدے کے مطابق اس کا تعلق سورج دیوتا کی چھٹی نسل سے تھا۔ کوئی آدمی بادشاہ کا نام نہیں لے سکتا ایسا کرنا گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہے۔ شاہی خاندان کے نام پر نام رکھنا بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ ایک دیہاتی غلطی سے اپنے بیٹے کا نام ہیرو ہیٹو رکھ بیٹھا۔ جب اسے پتہ چلا تو اس نے سارے خاندان کو مار کر خودکشی کر لی۔

ہیرو ہیٹو شاہی خاندان کا ۱۲۴واں بادشاہ تھا۔ وہ ۲۹ اپریل ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوا۔ ۱۹۲۴ء میں اس کی شادی ناگا کو سے ہوئی۔ بادشاہ کے تخت پر بیٹھنے کی رسومات بھی بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں۔ وہ شنتو کے مندر میں جا کر اپنے اجداد کی روحوں کو مطلع کرتا ہے کہ اس نے تخت سنبھال لیا ہے۔ کھلے رنگ کا ڈھیلا لباس پہن کر وزیراعظم سے اپنی تخت نشینی کی خبر سنتا ہے۔ اس کے بعد بادشاہ روحوں کے لیے ضیافت کا بندوبست کرتا ہے اور ایک کٹیا میں اپنے اجداد کی روحوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اس رسم میں تین اشیا کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ Mirror, Neklace and Sword یہ وہی تلوار ہے جو سورج کی دیوی نے ۲۶۰۲ سال پہلے جمو کو دی تھی۔ ان میں شیشہ کو سب سے زیادہ مقدس شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں سورج کی روح نظر آتی ہے۔ درحقیقت بادشاہ بھی اس کے اندر جھانک نہیں سکتا ہے۔ دور دور سے ہی نظارہ کرتا ہے۔ یہ شیشہ ایک کالے صندوق میں رکھا گیا ہے جس پر سفید ریشم کی چادر چڑھی ہوتی ہے۔ اسے ISE کے مندر میں رکھا گیا ہے۔ اس کی شبیہ والبتہ محل میں رکھا گیا ہے جس کمرے میں اسے رکھا گیا ہے اسے کاشی کو ڈوکورو کہتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق اس کو جنگ میں بطور آلۂ حرب استعمال کیا جاتا تھا۔ سورج کی روشنی اس پر منعکس ہو کر دشمنوں کو بصارت سے محروم کر دیتی تھی۔ نیکلس ٹوکیو میں رکھا گیا ہے۔ تلوار کی صرف شبیہ باقی ہے کیونکہ اصل جنگ میں گم ہو گئی تھی۔ تخت نشینی کے وقت یہ ہر بادشاہ کے ساتھ جاتی ہیں۔ اصل

آئینہ اسی کے مندر میں ہی رہتا ہے۔ ایسی جو کہ سورج دیوی کی رہائش گاہ ہے۔ اس میں بادشاہ اہم مواقع پر جاتا ہے۔ دراصل ہر وزیر، سفیر بھی وہاں حاضری دیتا ہے۔ جاپان میں نسلی تفریق نہیں۔ ساری قوم سورج دیوی کی اولاد تصور ہوتی ہے جس کا سربراہ بادشاہ ہے۔ شنٹو جاپانیوں کا قومی مذہب ہے ان کے دیوتاؤں کی تعداد اسی لاکھ سے زیادہ ہے۔

بادشاہ ٹوکیو کے محل کے خفیہ حصوں میں رہتا ہے جہاں تک عام آدمی کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ یہ محل کسی زمانے میں **Shoguns** کا قلعہ تھا۔ ۱۸۶۸ء میں یہ شاہی خاندان کے تصرف میں آ گیا۔ اس کے علاوہ بھی کئی محلات ہیں۔ گرمیوں میں شاہی خاندان **Hyama** کے محل میں منتقل ہو جاتا ہے۔

اسناد سفارش پیش کرنے کی رسم بھی بڑی دلچسپ ہے۔ سفیر اپنے ساتھ کوئی شخص نہیں لے جا سکتا۔ شاہ اس کو تنہائی میں شرف ملاقات بخشتا ہے۔ کمرے میں جا کر وہ گھٹنوں کے بل جھکتا ہے اور تین دفعہ کورنش بجا لاتا ہے۔ اسناد سفارت پیش کرنے کے بعد صرف چند رسمی جملے کہے جاتے ہیں۔ مترجم پاس ادب سے سرگوشی میں بات کرتا ہے۔ اس کے بعد سفیر اُلٹے قدموں سے کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ جب سابق امریکی نائب صدر گارنر شاہ کو ملنے گیا تو اس کا ارادہ تھا کہ وہ ایک ڈالر کی امریکی گھڑی شاہ کو دکھا کر کہے گا "یور میجسٹی! یہ واحد امریکی چیز ہے جس کا سستا چربہ جاپانی تیار نہیں کر سکے۔" جب امریکی سفیر کو پتہ چلا تو اس نے سخت احتجاج کیا۔ گارنر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "کیا غضب ڈھاتے ہو۔ وہاں کا عملہ بادشاہ کی توہین برداشت نہیں کر سکے گا اور خودکشی کر لے گا۔ ہو سکتا ہے کوئی دل جلا تمہارا کام بھی تمام کر دے۔" وہ ڈر گیا اور بادشاہ سے ملاقات پر گھڑی کو جیب سے نہ نکال سکا۔

۱۹۲۱ میں ہیروہیٹو بیرون ملک جانا چاہتا تھا۔ اس وقت وہ وارث تخت تھا۔ یہ ۲۵۸۱ سال میں پہلی مرتبہ ہو رہا تھا۔ لوگوں کو بڑا دکھ ہوا۔ ایک سو نوجوان لڑکوں نے خودکشی کی پیشکش کی تاکہ شہزادے کو باہر جانے سے روک سکیں۔ لندن جا کر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ چونکہ شاہی خاندان اپنے پاس کیش نہیں رکھتا اس لئے لندن کے ٹیوب اسٹیشن میں جب چیکر نے ٹکٹ مانگا تو وہ اس کے پاس نہیں تھا۔ کنڈکٹر کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سے ہم کلام ہے۔ اس نے بدتمیزی کی لیکن شہزادہ نہایت تحمل سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اتنے میں اس کا ذاتی عملہ پہنچ گیا۔ ٹکٹ ان کے پاس تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ایک محتاط کوشش کی گئی کہ بادشاہ کو **Humanize** کیا جائے۔ ۱۹۳۷ء میں پہلی مرتبہ بادشاہ نے فوجوں کی کمان خود سنبھالی۔ پرل ہاربر کے بعد صدر روز ویلٹ کی اپیل کا بادشاہ

نے خود جواب دیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ دنیا کا امیر ترین شخص کون ہے تو بلا تردد کہا جا سکتا ہے کہ وہ شاہ جاپان ہے کیونکہ سارا ملک اس کی ملکیت شمار ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر چیز پر وہ اپنا حق نہیں جتاتا۔

بااین ہمہ کاروبار حکومت بادشاہ نہیں بلکہ اس کے نام پر وزیراعظم چلاتا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد جو آئین بنا وہ بھی جنرل ڈگلس میک آرتھر اور جاپانی وزیراعظم یوشیدا نے مل کر بنایا۔ شکست دینے کے بعد امریکہ نے فوری طور پر جاپان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ اتحادی فوجیں بادشاہ کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کرنا چاہتی تھیں۔ یہ جنرل ڈگلس میک آرتھر تھا جس نے انہیں اس کے تباہ کن مضمرات سے آگاہ کیا۔ ساری قوم ایک بار پھر مرنے مارنے کے لئے تیار ہو جاتی۔ جنگ کے بعد جاپان نے جس طرح ترقی کی وہ حیرت انگیز ہے۔ ناگاساکی اور ہیروشیما کی تباہی کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس جنگ کا کوئی فائدہ نہیں جو جیتی نہ جا سکے۔ اسلحہ فیکٹریوں کے بجائے انہوں نے پیداواری اشیاء کے کارخانے کھڑے کر لئے۔ ٹوکیو شہر کو اقتصادی دنیا کا محور و مرکز بنا دیا۔

ہم کافی دیر تک محل کے اردگرد ٹہلتے رہے۔ گھنے درختوں کی وجہ سے عمارتیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ بیرونی دروازوں پر کھڑے سنتریوں نے جب مسلسل گھورنا شروع کیا تو خواجہ صاحب نے مشورہ دیا کہ واپس چلا جائے۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو ایک شاہراہ پر ایک جھنڈے والی کار نے ہمیں کراس کیا۔ اس کے آگے ایک موٹر سائیکل تھا جس کو پولیس سارجنٹ چلا رہا تھا۔

خواجہ صاحب نے پوچھا "جانتے ہیں یہ کون ہے؟"

"کوئی سرکاری افسر یا وزیر ہوگا"

"یہ وزیراعظم جاپان ہے۔" انہوں نے یہ بتا کر حیران کر دیا۔

"یہ ایشیا کے امیر ترین ملک کی سیکورٹی ہے۔ ایک ہم ہیں کہ اگر وزیراعظم نے کسی جگہ سے گزرنا ہو تو سات دن پہلے ہزاروں اہلکار جھاڑیوں اور بوٹوں تک کو سونگھنا شروع کر دیتے ہیں۔"

تیسرے دن ہم نے ٹوکیو کے پارک اور باغات دیکھے۔ لندن کی طرح یہ شہر بھی باغات سے بھرا پڑا ہے۔ ہرا بھرا شہر لوگوں کو Breathers مہیا کرتا ہے۔ ڈیڑھ کروڑ کی آبادی والے شہر کے لئے یہ ضروری بھی ہے۔ جاپانی باغات ایک اعتبار سے منفرد ہیں۔ ان میں پھولوں اور پودوں کی ہزاروں قسمیں ہیں۔ لوگ پھولوں اور سبزیوں کے اس قدر شوقین ہیں کہ اپنے گھروں کی چھتوں پر بھی انہیں اُگاتے ہیں۔

ٹوکیو ٹاور اور ایفل ٹاور میں صرف ایک فرق نظر آتا ہے۔ ایفل ٹاور دریائے سین کے

کنارے پر ہے اور اس کا ڈیزائن بھی قدرے بہتر ہے نہیں تو دنیا کے سب نادر کسی اسٹیل مل کے اشتہار نظر آتے ہیں جن پر ہزاروں ٹن لوہا صرف کیا گیا ہے۔

شہر کے باہر ہم نے صرف ایک جگہ دیکھی۔ ماؤنٹ فیجی جو ایک تسلسل کے ساتھ لاوا اگلتا ہے۔ خواجہ صاحب شہر کے مضافات میں ایک ہوٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "کیا آپ جانتے ہیں اس ہوٹل میں کون رہتا ہے؟" میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو بتانے لگے کہ یہ کتوں اور بلیوں کا ہوٹل ہے۔ مالکان جب پکنک یا چھٹیاں منانے باہر جاتے ہیں تو اپنے پالتو جانوروں کو ان ہوٹلوں میں چھوڑ جاتے ہیں جہاں ہوٹل کا مستعد عملہ ان کی ٹہل سیوا کرتا ہے۔ وقت پر انہیں نہلاتا ہے۔ گوشت اور دودھ کھلاتا پلاتا ہے۔

"کمال ہے!" میں نے حیرانی کا اظہار کیا۔

بولے "یہ بڑے مہنگے ہوٹل ہیں۔ یہاں صرف امیر لوگوں کے جانور ٹھہرتے ہیں۔ واپسی پر وہ انہیں اس طرح گلے لگاتے ہیں، چومتے چاٹتے ہیں جس طرح ہمارے ہاں لوگ اپنی اولاد کو پیار کرتے ہیں۔

جب ہم ماؤنٹ فیجی پہنچے تو ہر طرف جلے ہوئے پتھروں کی بو تھی۔ سارا پہاڑ کوئلے کا بنا ہوا لگتا تھا۔ خواجہ صاحب بتانے لگے کہ جاپان Volcanic Islands کا Archipelago ہے۔ جہاں ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ زلزلے آتے ہیں۔ آتش فشاں پہاڑ لاوا اگلتے ہیں۔ سیاح پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سڑک کے ایک طرف پہاڑ تھا دوسری طرف چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹ تھے جہاں پر Snacks اور سافٹ ڈرنکس دستیاب تھے۔

خواجہ صاحب کے اصرار پر ہم نے چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ تھکن سے سانس اکھڑنے لگی۔ ہمیں کچھ خریدنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ٹفن کیریئر میں قیمے کے پراٹھے، چکن سینڈوچ اور فرنچ ٹوسٹ بنا کر لائے تھے۔ پہاڑ سے نیچے اتر کر ایک وسیع میدان میں ہم نے گاڑی روک لی۔ کھانا کھایا۔ کچھ دیر آرام کیا اور واپس چل پڑے۔ راستے میں بڑا اچھا لینڈ سکیپ تھا۔ حد نگاہ تک سبزے کا وسیع سمندر نظر آتا تھا۔ جب شہر کے مضافات میں پہنچے تو آگے کئی میل تک گاڑیوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ ٹریفک کے حادثے کی وجہ سے سڑک بلاک ہو گئی تھی۔ الیکٹرانک سوچ بورڈ بتا رہا تھا کہ دو گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا۔ "برے پھنسے!" میں نے سوچا۔ ٹوکیو پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔ میں انہیں خیالات میں غرق تھا کہ گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ چل پڑی۔ "کیا ٹریفک کھل گیا ہے؟"

بولے "نہیں میرا ایجنٹ پہنچ گیا ہے۔"

خواجہ صاحب نے گاڑی سڑک کے شولڈر پر

ڈال دی تھی۔ انتظار کرتے ہوئے جاپانی بڑی حیران نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ غالباً اس قسم کا منظر انہوں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ٹریفک کی خلاف ورزی اور وہ بھی اس قدر سنگین نوعیت کی۔ کئی ڈرائیوروں نے غصے سے ہارن بجائے، میں نے بھی منع کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے ان کا چالان ہو جائے۔

کہنے لگے "شاہ جی! آپ نے کون سا روز روز آنا ہے۔ واپس جا کر آپ دوستوں کو کہیں گے خواجے سے یہ بھی نہ ہو سکا۔"

ہم معجزاتی طور پر سب رکاوٹیں پھلانگ گئے۔ اتفاق سے کسی پولیس سارجنٹ سے بھی ٹاکرا نہ ہوا نہیں تو گاڑی کے ساتھ ساتھ خواجہ صاحب بھی اندر ہو جاتے۔ دبنگ انسان تھے ایک نعرہ مستانہ کے ساتھ ہر دام سے باہر نکل آئے۔

آخری دن اس اعتبار سے اہم تھا کہ خواجہ صاحب کے پاس کھانے، دکھانے اور سنانے کے لئے بہت کچھ تھا۔ ہنس کر کہنے لگے "آج کا دن میرا ہے۔ آپ نے اتنا ہی اور وہ کچھ کھانا ہے جس قدر میں کہوں گا۔ آنکھ اور کان کھلے رکھنے ہیں اور کسی بھی جگہ جانے سے انکار نہیں کرنا۔ آج ہم کار پر نہیں جائیں گے بلکہ ٹیوب اور ٹیکسی استعمال کریں گے لیکن بیشتر وقت پیدل چلنا ہے۔ بہتر ہوگا کہ جوگرز پہن لیں، جوتوں کے ساتھ شاید اس قدر چل نہ پائیں گے۔"

عرض کیا "مجھے اپنی نہیں آپ کی فکر ہے۔ اس ڈیل ڈول کے ساتھ کہاں تک چل پائیں گے؟"

بولے "آپ دیکھتے جائیں۔ میں پہلوان تو نہیں لیکن پہلوانوں جیسا دم خم ضرور ہے ویسے بھی ٹوکیو کی سڑکیں اور راستے میرے دیکھے بھالے ہیں"

ہم ناشتہ کر کے گھر سے نکلے تو صبح کے نو بج رہے تھے۔ ان کے گھر کے قریب ہی اندر گراؤنڈ سٹیشن تھا، بے پناہ رش تھا۔ مرد و زن ایک دوسرے سے جڑے کھڑے تھے۔ بس بغلگیر ہونے کی کسر رہ گئی تھی۔ ہمیں بڑی مشکل سے کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ چالیس منٹ کا سفر بڑا تکلیف دہ لیکن دلچسپ تھا۔ ہر سٹیشن پر سینکڑوں لوگ اُترتے تو اس سے کہیں زیادہ سوار ہو جاتے۔ جب ٹرین ڈاؤن ٹاؤن سے باہر نکلی تو رش کم ہو گیا اور ہمیں بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔

ہم کہاں جا رہے ہیں؟ میں نے خواجہ صاحب کی طرف دیکھا۔ بولے خرابات سے پہلے مساجد دیکھ لی جائیں۔ آج میں آپ کی ملاقات سعودی عرب کے امام مسجد اور اسلامک سنٹر کے امام احمد سے کراؤں گا۔ اس کے علاوہ ترکی کے مبلغ مصطفیٰ سے ملواؤں گا۔ دونوں تبلیغ اور تعلیم پر مامور ہیں۔

"سعودی عرب جاپان میں بھی پہنچ گیا ہے؟" مجھے قدرے حیرت ہوئی۔

[جاری ہے۔]

سب بدل جائے گا

کیا خبر تھی ہمیں
ایک دن سو کے اٹھیں گے تو ایک دم
رات ہی رات میں
سارے کلیے کہ جن کی مدد سے رواں
تھا یہ نظمِ جہاں
سب بدل جائیں گے!!!

ایسے گزرے گا صحرا سے یہ کارواں
گرد پا کا نشاں بھی نہ ہوگا کہیں
نہ تو اُکھڑی طنابیں نظر آئیں گی
اور نہ بجھتی ہوئی راکھ ہوگی کہیں!

سب وہ معیار بھی
جن کی تشکیل میں
جانے کتنی ہی صدیوں کا تھا تجربہ
ایک بھولی ہوئی یاد کے روپ میں
ایسے ڈھل جائیں گے

جیسے تھے ہی نہیں
یوں لگے گا کہ ان سے کوئی واسطہ
ہم کو تھا ہی نہیں
زندگی کا یہی روزِ آغاز ہے
اس سے پہلے یہاں کچھ ہوا ہی نہیں

کس کو معلوم تھا
بنک کے لاکروں کی وہ سب چابیاں
اور الماریوں میں بنائے گئے
خفیہ خانوں کی ساری وہ جادوگری
جیب میں یا کسی طاقچے میں پڑے
چند سکوں کی بے نام موجودگی
کانپتے ہاتھ سے
اوڑھنی کے کناروں سے باندھے ہوئے
اور ان سے پرے
جتنے بھی داؤ تھے
سب ہی رہ جائیں گے اب دھرے کے دھرے

امجد اسلام امجد

جتنے بھی نوٹ تھے
جگمگاتے ہوئے کڑکڑاتے ہوئے
جن کی خاطر تھے سب لائنوں میں لگے
ان کو ردّی سے پُر ٹوکری میں کہیں
بیٹھنے کی جگہ بھی نہ مل پائے گی!

تنگ دل سرپھری سی ہوا میں یہ سب
خشک پتوں کی صورت بکھر جائیں گے
اور وارث انھیں بانٹنے کے لیے
ایک دوجے کی گردن نہ کاٹیں گے اب
بے اثر ہوں گے ان پر لکھے لفظ بھی
اور ضامن بھی ان کے بکھر جائیں گے

کس کو معلوم تھا!
ایک ہی رات میں
زندگی ہم سے آگے نکل جائے گی
ہوگی دنیا بظاہر وہی کی وہی
اور اس کی کرنسی بدل جائے گی

(مرحومہ) اہلیہ محترمہ سیدہ نفیسہ خاتون کی نذر

اکیلے رہ کے جینا ہے

حسن عسکری کاظمی

مجھے تم سے محبت ہے مگر ایسی محبت
جس میں اب وہ گرم جوشی، بے قراری
اور تڑپ دل میں نہیں پھر بھی مجھے تم سے محبت ہے
کہ میں نے تم کو چاہا تھا
تمہیں گھر لے کے آیا تھا، محبت رنگ لائی تھی
ہمارے پھول سے بچے ہمارے گھر کی رونق ہیں
مگر وہ گرم جوشی، بے قراری اور تڑپ دل میں نہیں
پھر بھی مجھے تم سے محبت ہے
یہ سچائی زباں پر آ گئی آخر کہ ہم اب مطمئن ہیں
اور اگر ایسا بھی ہو اک دن جدا ہونے کا وقت آئے
تو دو آنسو بہا کر ہم نصاب زندگی بدلیں
ورق پر جو بھی لکھا ہو اسے پڑھ کر نصیب دشمناں
بے نور آنکھوں سے اسے مٹتے ہوئے دیکھیں
کہ انجام محبت یوں بھی ہوتا ہے
کسی اک نے خوشی سے دوسرے کا غم بھی سہنا ہے
اکیلے رہ کے جینا ہے
یہ زہرِ غم بھی پینا ہے

ماسک! [احسن سلیم کی رحلت کے بعد]

صفدر صدیق رضی

[نثری نظم]

جب بھی میں اس سے ملنے گیا
انتظار اس کے بستر پہ دائم بچھا تھا
نظر در کی چوکھٹ کے مابین ساکت کھڑی تھی
اداسی کا ٹھہرا ہوا سایہ
دہلیز تک خیر مقدم کو بڑھتا چلا آ گیا تھا
مسلسل مری آمد و رفت پر
ڈاکٹر نے جو اک ماسک
بیمار کے سامنے بیٹھتے وقت
منہ پر پہننے کی تلقین کی تھی
مرے پاس ابھی تک وہ محفوظ ہے
اس کی رحلت کے بعد
اب بھی وہ ماسک اکثر پہنتا ہوں
جب تعزیت کے لیے آ کے
وہ لوگ اظہار افسوس کرتے ہیں
جو اک طویل اور مہلک علالت کے دوران
اسے دیکھنے تک نہیں آئے

مختصر نظمیں

مصنوعات

زبانوں پر سجے گی بات اچھی
تجارت میں لگیں برکات اچھی
خریداروں کو کھینچیں گی مسلسل
اگر ہوں اپنی مصنوعات اچھی

سوچے گا

نہیں کچھ رد رعایت سوچے گا
کرے گی عدل فطرت سوچے گا
یونہی بڑھتے نہیں زر کے ذخائر
مقدر ہے کہ محنت سوچے گا

بنگلہ دیش

سبھی چاہیں کہ آئیں خویش آگے
نکلتے ہیں مگر درویش آگے
جسے ہم نے وطن سے خود نکالا
ہوا ہم سے وہ بنگلہ دیش آگے

مگرمچھ

کسی درگاہ میں بیٹھے ہوئے ہیں
رسد کی چاہ میں بیٹھے ہوئے ہیں
کوئی مچھلی ادھر آئے گی کیسے
مگرمچھ راہ میں بیٹھے ہوئے ہیں

سیاستدان

مدد پر کوئی راضی کیا کرے گا
نہیں خوشحال ماضی کیا کرے گا
سیاست ہے میاں بی بی کی ایسی
بھلا ایسے میں قاضی کیا کرے گا

گلزار بخاری

نئے سال کے نام

پھر طلوعِ سالِ نو ہے
پھر وہی ڈھلتا سفر ہے
دور تک یادوں کی دھندلی رہ گزر ہے
دھند میں چھپتا ہوا
اک پیڑ ہے، اک نام ہے،
اک پھول ہے
یا برف کے دھبوں سے چپکی
نم زدہ کچھ دھول ہے
اک چشمِ وارفتہ کے پہلو میں
بجھے دل سے پرے خوابِ شکستہ
اک شبِ رفتہ
ہے شاید نیم رفتہ
رنجِ آئندہ کا سرمایہ
اثاثہ مہلتِ غم کا
ذرا کم۔۔۔
اور کم ہونے لگا ہے
نذرِ تعبیرِ الم ہونے لگا ہے
پھر وہی کچھ آشنا لمحوں کی بے حس
اجنبیت
قہقہہ زن
پھلجھڑی سے
آنسوؤں کی جھنجھناہٹ
درد کی سنجیدگی سے
زخم کی رونیدگی تک
بار ہا بیتی ہوئی خوشبو کی آہٹ
سانس میں گھلنے لگی ہے
پھر مہکتے، نو شگفتہ سال کی کھڑکی
گزشتہ سال کے
خاموش، اجڑے لان میں
کھلنے لگی ہے
ریزہ ریزہ سا پہر ہے
پھر وہی ڈھلتا سفر ہے
کیا نشیلی دھن ہے جی میں
کیسی لے ہے! کیسی رو ہے۔۔۔!
پھر طلوعِ سالِ نو ہے

حامد یزدانی

تو پھر ملنے چلے آنا

مجھے تم سے محبت ہے
میں تم سے پیار کرتا ہوں
یہ تم بھی جانتے ہو کہ یہاں پر
کسی کو بھی کسی سے بات کرنے کی
ذرا فرصت نہیں ملتی
یہاں پر ہر کوئی ہی زندگی کی اس گھنی مصروفیت
سے زخم خوردہ ہے
مجھے معلوم ہے سب کی طرف مصروف ہو تم بھی
سبھی کی طرح میں بھی کام میں مصروف رہتا ہوں
مگر اپنی گھنی مصروفیت میں بھی
تمہیں میں ساتھ رکھتا ہوں
مجھے تم سے محبت ہے
میں تم کو یاد کرتا ہوں
مجھے تم اچھی لگتی ہو
تمہارے مسکراتے چہرے کی طرح حسیں آنکھیں
سبھی کے درمیاں مجھ سے وہ ساری بات کرتی ہیں
جو تم چاہو بھی تو اپنے لبوں سے کہہ نہیں سکتیں
مجھے معلوم ہے ہم دونوں ہی رشتوں کے قیدی ہیں
یقیناً تنگ نظر لوگوں سے تم کو خوف آتا ہے
یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن یہ تم کو یاد تو ہوگا
پرانی بات ہے جب ایک محفل میں مجھے مل کر
تمہی نے میرے کانوں میں یہی چپکے سے بولا تھا
جو آنکھوں کو لگے اچھا اُسی کو حسن کہتے ہیں
تمھیں میں اچھا لگتا ہوں
مجھے تم اچھی لگتی ہو
مجھے تم سے محبت ہے
کبھی ملنے کو جی چاہے تو پھر ملنے چلے آنا

طاہر ناصر علی

سفاری نائٹ......وین گاف

یہ آبادی کہیں نہیں ہے
کہیں نہیں یہ شہر
ریت اڑاتا سبزہ ہے اور رات کا آخری پہر
سر ٹکراتا ہے، گرتا ہے
لو، دم توڑ رہا ہے
پاگل خانے کی دیوار کے نیچے مرا جنون
اپنے آپ سے ڈر کر شاید
کانپ رہے ہیں سرو
مٹی کے ٹیلوں سے لپٹ کر
روتے ہیں زیتون
آسمان کالا ہے
کالا موسم
کالی رات
کائنات کے گرد فضا کو گھیرے ہیں آفات
چاند کی آنکھیں سوج گئی ہیں
پھول گئے ہیں تارے
بہلانے آئے تھے مجھ کو
بھول گئے ہیں تارے
بین ہوا کرتی ہے
سر میں مینڈک ٹراتے ہیں
زرد ستاروں کی چیخوں سے
کان پھٹے جاتے ہیں
کون خدا ہے
کون مسیحا
کس کو کروں تلاش
میرے سینے میں سڑتی ہے
مستقبل کی لاش

شاہنواز زیدی

دعا

میں بے کمال ہوں مجھ کو کمال دے مولا
مرے شعور کی دنیا اجال دے مولا

میں نفرتوں کے مقابل ہوا ہوں سینہ سپر
مجھے تو اپنی محبت کی ڈھال دے مولا

سحر کے نور سے دنیا اجال دے میری
مہیب شب کا سفر سر سے ٹال دے مولا

ہر ایک شخص مرے فن کا معترف ہو یہاں
میرے خیال کو ایسا جمال دے مولا

تو کارساز ہے اقبال کی صدا سن لے
بھنور سے کشتۂ جاں کو نکال دے مولا

اقبال سروبہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ تنہا رافع ، اونچی سوچوں کا
ہر موسم پرتو ، اس کے رنگوں کا

”سانحہ مچھ بلوچستان میں ہزارہ مزدوروں کے بہیمانہ قتل پر“

کوئلے کی کانوں میں تم اتر کے دیکھو تو
تنگ و تار و پیچیدہ اُلجھے اُلجھے رستے ہیں
کالی کالی دیواریں
ہیں فضائیں زہریلی
درد کی سیاہی میں سارے چہرے لپٹے ہیں
جان ہتھیلی پر رکھ کر
کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والوں کے
سیاہ کالے ہاتھوں کی ایک ایک جنبش سے
کوہ کن گھرانوں کی آخری اُمیدیں کچھ اس طرح ہیں وابستہ
جیسے گھور اندھیرے میں ٹمٹماتا اک تارہ
یہ جفاؤں کے مارے، یہ وفاؤں کے عادی
اپنے رزق پر شاکر، اپنے حال پر صابر
تم سے کچھ نہیں کہتے، کچھ طلب نہیں کرتے
سر جھکائے قسمت پر
بوجھ اُٹھائے گھر بھر کے ان کہے عذابوں کا، چاہتوں کا، خوابوں کا
کوئلے کی کانوں میں کام کرتے رہتے ہیں
دن گزرتے رہتے ہیں

آج کا یہ دن لیکن کیا عجیب دن نکلا
تم نے بربریت سے قتلِ عام کر ڈالا
ان غریب لوگوں کا
جس پہ ظلم شرمائے، تم نے وہ ستم ڈھایا
یہ تو چپ تھے پہلے بھی، اب بھی ہیں یہ لب بستہ
یاد تم مگر رکھنا
آہ..... قلبِ سوزاں کی
تا فلک جو پہنچے گی
ظلم و جور کا سارا پردہ چاک کر دے گی
تم کو راکھ کر دے گی

افشاں سجاد

SUNSHINE ON THE WALL

There was the seed of a dream
In the soil of the eye
the effect of which
Made me defiant

Beyond the familiar sky
Life started adorning
Unknown paths

Sunshine on the wall
became more radiant
Heartbeats started falling
again in a rhythm

دھوپ دیوار پر

آنکھ کے کھیت میں
خواب کا
بیج تھا
جس کی تاثیر نے
مجھ کو سرکش کیا
آشنا آسماں سے پرے...... زندگی
اجنبی راستوں کو سجانے لگی

دھوپ دیوار پر
جگمگانے لگی
دھڑکنیں پھر سے
ترتیب پانے لگیں

منظر حسین اختر

Translated by Pro. Muzzaffar Bukhari

منافقت

[نثری نظم]

امجد بابر

وہ شخص
جو ہمیں دیکھنا سکھاتا ہے
ہم اس کی آنکھیں نکال لیتے ہیں

وہ شخص
جو ہمیں سچ بتاتا ہے
ہم اسے زہر پلا دیتے ہیں

وہ شخص
جو ہمیں نئی راہ دکھاتا ہے
ہم اس کی ٹانگیں کاٹ دیتے ہیں

وہ شخص
جو ہمیں آسمان کی سیر کراتا ہے
ہم اسے زمین کی تہہ میں
دفن کر دیتے ہیں

وہ شخص
جو ہمیں سبز باغ دکھا رہا ہے
سفید گلاب جیسا ہے

وہ شخص جس نے جھوٹ بولا تھا
دھوکہ بھی دیا تھا
ہم پھر اسی کے پاس بیٹھے ہیں

کشمیر بھڑکتے ہوئے شعلوں کا نگر ہے

بارود، دھواں، آگ بنا رختِ سفر ہے
کشمیر بھڑکتے ہوئے شعلوں کا نگر ہے

آسیب زدہ پیڑ ہوئے، زخمی ہوائیں
مقتل ہوئے آباد نہیں سر پہ ردائیں
طوفانِ الم کے ہیں تو بے درد گھٹائیں
اب عرش پہ پہنچیں گی پرندوں کی دعائیں
وحشت ہے قیامت کی نگاہوں میں بھی ڈر ہے
کشمیر بھڑکتے ہوئے شعلوں کا نگر ہے

اک جنتِ ارضی جو بنی نار جہنم
وہ جبر مسلسل ہے کہ ہر آنکھ ہے پُرنم
گھاؤ پہ لگاتا ہی نہیں کوئی بھی مرہم
ہر حال میں لہرائیں گے اسلام کا پرچم
تلواروں کے سائے میں کٹا اپنا سفر ہے
کشمیر بھڑکتے ہوئے شعلوں کا نگر ہے

اب گھور اندھیروں میں سحر دیکھ رہے ہیں
ظالم کی نگاہوں میں بھی ڈر دیکھ رہے ہیں
مقتل کے نشاں زیر و زبر دیکھ رہے ہیں
طوفان پریشان تو حیرت میں بھنور ہے
کشمیر بھڑکتے ہوئے شعلوں کا نگر ہے

یہ عزمِ جواں قابلِ تسخیر نہیں ہے
زندان میں رہنا ہی تو تقدیر نہیں ہے
اجداد کے خوابوں کی یہ تعبیر نہیں ہے
ہم ہیں تو پھر اب پاؤں میں زنجیر نہیں ہے
منزل پہ ہی دم لیں گے کٹھن جتنا سفر ہے
کشمیر بھڑکتے ہوئے شعلوں کا نگر ہے

شہ رگ تو ہے سانسوں سے مری جان کا رشتہ
کشمیر سے عزت کا ہے اور مان کا رشتہ
کہسار سے مضبوط ہے ایمان کا رشتہ
ساگر سے بھی گہرا ہے مسلمان کا رشتہ
چھوڑوں گا نہ جنت کدہ فیصل میرا گھر ہے
کشمیر بھڑکتے ہوئے شعلوں کا نگر ہے

فیصل زمان چشتی

نئے سال کے موقع پر

پھر نیا سال آ گیا ہے میاں
یاد کیا کیا دلا گیا ہے میاں

تجھ سے پہلے جو گزرا ہے وہ سال
کر گیا ہے ہمارا مندہ حال

پچھلے سالوں کا ذکر کیا کرنا
کیا جینا ہے اور کیا مرنا

ذہن پر بوجھ ہے نہ جانے کیا
تری مرضی ہے اے زمانے کیا

تجھ کو خوش آمدید کہتے ہیں
گرچہ ہر رنج درد سہتے ہیں

ہم پہ کیا کیا گزرنی ہے آگے
کیسے ٹوٹے ہیں زیست کے دھاگے

اے نئے سال یہ بتا مجھ کو
دی ہے کس بات کی سزا مجھ کو

کتنے لوگوں کے گھر اجڑ گئے ہیں
کتنے اہلِ نظر اجڑ گئے ہیں

کتنی گودیں اجاڑ کر گیا تو
کتنے پیاروں کو مار کر گیا تو

کتنے بچے ترا شکار ہوئے
زندگانی کے دور پار ہوئے

قبر کی گود میں اتر گئے لوگ
اپنی آنی سے پہلے مر گئے لوگ

اے نئے سال اب نہ ایسا ہو
جیسا ہم چاہتے ہیں ویسا ہو

ہم کو کوئی خبر خوشی کی دے
اک نوید اچھی زندگی کی دے

عابدی یہ دعا ہے مری آج
آئے یہ سال لے کے امن کا تاج

علی حسین عابدی

نئے سال کی پہلی نظم

سال نو،

تیرے معصوم چہرے کا صدقہ اُتاروں

تیرے بازو پہ تعویز باندھوں

تجھے اپنی بانہوں کا جھولا جھلاؤں

تجھے نظرِ بد سے بچاؤں

سال نو،

تیری مدھم سی غوں غوں کو باتوں میں ڈھالوں

تو گرے تو سنبھالوں

تیرا پہلا قدم جنوری میری امید ہو

سال نو، میرا ہر دن اسی ایک خواہش میں گزرے

سال نو، اُن گزرتے دنوں میں تو ہی سال نو تھا

اور میں اک قدیمی گداگر کی صورت تیرے ساتھ تھا،

سال نو، تو مجھے بھی کبھی لمحہ لمحہ بڑا کر،

جنوری اور دسمبر کی سیڑھی چڑھا، میرے قد کو بڑھا،

میں بہتر برس سے یونہی ایک بونا بنا دشت میں پھر رہا ہوں

سالِ نو،

آسماں سے میرے واسطے کوئی تعویذ لے،

کوئی منتر بتا،

جس کو پڑھ کر، مجھے بھی لگے، میں بھی انسان ہوں

مغربی اور شمالی جنوبی بشر، مجھ کو دیکھیں،

مجھے بھی بشر کہہ سکیں،

سالِ نو، تو مجھے ساتھ لے، کم سے کم

بارہ قدموں تلک تو مجھے ساتھ لے

تاکہ میں بھی کہوں، ہاں مجھے سالِ نو کی حمایت محبت، عقیدت

سبھی کچھ میسر ہے

اور میں اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے تین سمتوں کے روشن بشر کی طرح

خود کو بھی —— اک بشر کہہ سکوں، سالِ نو، یہ کرامت دکھا

مجھ کو پاتال سے آسماں کی طرف

ایک سیڑھی چڑھا،

ایک سیڑھی چڑھا

اعجاز رضوی

نثری نظم

تمہاری اور میری سوچ میں صدیوں کا فاصلہ ہے
میں اگر قرنوں تک چلوں بھی تو اسے پاٹ نہیں سکتی
کیکر پہ گلاب نہیں کھلتے
نیم کی کڑواہٹ کو شہد بھی میٹھا نہیں کرسکتا
بغض اور عناد دل کے شفاف آئینے کو
اتنا گدلا کردیتے ہیں کہ اسکی سیاہی دھونے کو
اشکوں کا سمندر بھی کم پڑ جائے
ساتھ چلنے والے ہمیشہ قریب نہیں ہوتے
کبھی کبھی قربتیں بھی
فاصلوں کا سبب بن جایا کرتی ہیں
سوچ کا تفاوت نئے نظریات کو جنم دیتا ہے
بیزاری رشتوں میں دراڑیں ڈال دے
تو لاکھ مصلحت کے دھاگے سے بنت کرو
معافی تلافی کی کترنیں
رشتوں کا یہ خلا بھر نہیں سکتیں
بلکہ منظر کو کچھ اور بدنما کردیتی ہیں
مخالف سوچ لے کر ایک سمت سفر کرنے سے
راستہ تو کٹ جاتا ہے
مگر تھکن اعصاب کو بوجھل کردیتی ہے
سو اب مجھے پڑاؤ ڈالنے دو
تمہاری ہمسفری نے وجود میں اتنی تھکن بھردی ہے
کہ اگلے سفر کی طرف قدم اٹھانا بھی چاہوں تو ممکن نہیں
مجھے زندگی سے رخصت دو
تمہیں پرانے راستوں کی نئی منزلیں مبارک
مجھے اب سانس لینا ہے

نائلہ راٹھور

خطوط

آصف ثاقب

واجب الاحترام عمران منظور صاحب "والا مقام بیاض"

السلام علیکم!

بارش نے بوئی کے ایسے مقام کو اور دور کر دیا ہے۔ پوسٹ آفس کی سرگرمیاں بھی ٹھنڈی پڑی ہوئی تھیں۔ آپ جانیں بوئی کی "جائے وقوع" ضلع ایبٹ آباد کے مشرقی کونے میں مظفر آباد (آزاد کشمیر) کے سامنے دریا کنہار کے کنارے ہے بوئی ضلع ایبٹ آباد کا مشرقی موضع ہے۔ کنہار اس کے بالکل قریب ہے اس خصوص میں، محترمہ شبہ طراز نے کیا خوب کہا ہے:

جھرلوں کی آواز
منظر پہنوں جیسا تھا
دریائے کنہار

خالد احمد کے بیان میں ان کا شعری اختصاص دل پزیر صورت ہیں۔ حسب معمول ہے۔ ان کی شاعری کی توجیہات اور ترجیحات اپنے پیرائے رکھتی ہیں۔ تازہ بیاض کی تحریریں من موہ لینے والی ہیں۔ محمد ارشاد صاحب کا اُسلوب اسی طرح محترم و موثر ہے۔ ان کے قلم کی دھاک دور دور تک بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ نسیم سحر صاحب کو اپنا ایڈریس بتا دیں تو مہربانی ہوگی کہ نسیم سحر آپ کے "متاثرین" میں سے ایک ہیں۔ ارزاہ کرم نسیم نے اپنی عقیدت نگاری کی کتاب "محور دو جہاں" سے مجھے سرافراز کیا ہے۔ ان کی حمد یہ نعتیہ اور سلامیہ شاعری تاثیر بھری ہے۔ نسیم سحر کی شاعری 'جذب و جنوں' کے اعتبار سے "مرقع فن" ہے۔ نسیم سحر اور آفتاب احمد ملک نے اپنے اپنے خط میں مجھے بھی 'نظر نوازش' سے دیکھا ہے خدا ان کو خوش و خرم رکھے۔

"خطوط" میں دوستی اور محبت کا جذبہ دل کو چھونے والا ہے۔ "لاہنجم" سے ہٹ کر یہاں اظہار رائے کے معیار کو سلامت رکھا گیا ہے۔ خوشی ہوتی ہے احباب کے خطوط پڑھ کر ان دنوں جلسوں میں "اردو" کو "مورد تنقید بے جا" کہا گیا ہے اس سے رنج ہوا۔ لاہوریوں کو بلاوجہ بدنام کرنے کی "کوشش مذموم" کی گئی ہے اس سے رنج ہوا۔ یہ لاہور ہی تو ہے جہاں پاکستان کے لیے بہت بڑا جلسہ ہوا۔ قائداعظم لاہور کے دل دادہ تھے۔ انھوں نے لاہور میں کئی کامیاب جلسے پاکستان کے حصول کی خاطر کیے۔ اس ضمن میں اپنا کلام بھیجتا ہوں۔ عنوان ہے "اردو مری زبان"۔ "لاہوریوں کے نام"۔ آپ نے تازہ بیاض میں اس ناچیز کو عزت بخشی ہے۔ میں آپ کا ہمیشہ سے شکر گزار ہوں۔ ذکی طارق کا یہ شعر کتنا "سال نو مبارک" شعر ہے:

یہاں پہ ہو گیا نایاب بھائی چارہ اب　　دعا کرو کہ وہی عہد پھر پلٹ آئے

ہم دعا ضرور کریں گے۔ پاکستان کے استحکام، سلامتی، خوشحالی اور امانت دیانت کے لیے اور قیادت کی خوش نیتی کے لیے۔ یہی اگر صورت حال ہو تو اس کا اثر ہمسایگی کی خوش اوقاتی بھی وضع کر سکتا ہے۔ جانے دو بحثیں بانٹنے والے کیا ہوئے ایک دوسرے کے حقوق کی پاس داری "بڑی بات" ہے۔ ناگاہ نظر کشمیر کی طرف بھی اُٹھ جاتی ہے۔ شوکت محمود شوکت بھی خوب کہتے ہیں:

مگر ہیں اہل جہاں شاد اس قدر شوکت　　کہ دے رہے ہیں نئے سال کی مبارکباد

شوکت علی شاہ کی بدولت "بیاض" کا ایک حصہ اور طرح سے "باغ و بہار" ہے۔ وہ بڑے دلچسپ انداز سے سیر کراتے

ہیں۔ لفظوں کی سیر، منظروں کی سیر اور جذبوں کی سیر۔ وہ کالم میں بھی وصف سفرنامہ زندہ رکھتے ہیں۔
بہت کچھ کہنا تھا مگر کہا نہیں گیا۔ اعجاز کنور راجہ، وزیر آباد (شمس برج) کو مبارکباد کہہ کر لاہور میں جا بسے ہیں ان کی "یہ شاعری شمس برج کی مرہونِ منت ہے۔ دیکھا کہیں کیسے ہو۔
نیر انداملش

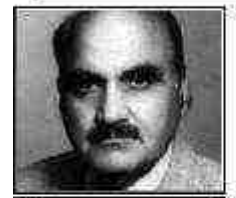

جمیل یوسف

مکرمی جناب عمران منظور صاحب! سلامت رہیں۔
سال نو پر "ریاض" نے دعا کا تصویری حسن زیب تن کیا ہوا ہے۔ جزاک اللہ مجھے اپنے
دو شعر یاد آ رہے ہیں۔ دعائیہ اشعار ہیں:

اک انقلاب مری خواہشوں سے پیدا ہو
اک آفتاب مرے رتجگوں سے پیدا ہو
ہوائے شوق کسی دن تو اس طرح سے چلے
گلِ مراد ، مرے آنسوؤں سے پیدا ہو

آپ جانتے ہیں میں غزل کا شیدائی ہوں۔ میں نے اپنی غزلوں کے کلام کا نام بھی غزل رکھا ہے۔ اس کی تصویر "ریاض" میں آ گئی ہے۔ زیادہ تر مجھے غزل (یا نعت) ہی اپنی طرف کھینچتی ہے۔
عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ غزل عورتوں سے باتیں کرنے کو کہتے ہیں۔ تو گرد والیوں نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن کہا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے میں سمجھتا ہوں غزل کے لفظ کو غزال سے گہرا تعلق ہے۔ غزال یعنی ہرن کو جب اپنے تعاقب میں آتے ہوئے شکاری کی آہٹ آتی ہے اور اسے خطرہ محسوس ہوتا ہے تو اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلتی ہے۔ اسے غزل کہتے ہیں۔ جیسا کہ غالب نے کہا ہے:
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں
"ریاض" میں شائع ہونے والی غزلوں کے حوالے سے بات کرتے ہوئے میں معتبر ترین شاعر جناب آصف ثاقب کو خراج تحسین و عقیدت پیش کرتا ہوں۔ ان کا رہوار غزل مسلسل اور بے تکان رواں دواں ہے۔
ان کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے۔ وہ ایک بڑے شاعر ہیں اور بڑے فنکار ہیں۔ ان کی بڑائی کی ایک دلیل یہ ہے کہ وہ بڑی فراخ دلی سے دوسرے شاعروں کو داد دیتے ہیں۔ زیر نظر "ریاض" میں ان کی غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ندیم و فیض نے جس غزل کو چمکایا — انھیں زمانہ خدا کی قسم نہ بھولے گا
ہوئے ہیں کتنے بہت شاعری کے دیوانے — جنہیں کلام فراز و ندیم نہ بھولے گا
نئے مزاج کی جدت ہے خالد احمد کی — لکھا جو اس نے وہ کاغذ قلم نہ بھولے گا

اللہ تعالیٰ جناب آصف ثاقب کو سلامت رکھے۔ آمین۔ جناب امجد اسلام امجد بھی عہد حاضر کے ایک بڑے شاعر ہیں۔ مجھے ان کی غزل کے مندرجہ ذیل اشعار پسند آئے ہیں اور میری پسند بڑی اہم ہے۔

ہم سفر تھے بھی اور نہیں بھی تھے — ہم عجب فاصلے سے ساتھ چلے
کیا یقیں تھا کہ جس کی خاطر ہم — جبر سے واہمے کے ساتھ چلے
فاصلوں میں کمی نہیں آئی — راستے بھی ہمارے ساتھ چلے
اس کی منزل کہیں پہ ہے ہی نہیں — وہ جو ہر راستے کے ساتھ چلے
دھوپ ایسی ہے کیا کہیں امجد — اپنا سایہ نہ اپنے ساتھ چلے

ایک اور معتبر شاعر جناب حسن عسکری کاظمی کے ان اشعار کی داد دینا چاہتا ہوں:

بوئے گل پھیلی اگر صحن چمن میں شب بھر — ڈھل گئے نور کے پیکر میں صبا اور دیا
اک دیا طاق پہ رکھا بھی اندھیرا ہے وہی — کتنی تاریک ہوئی رات جلا اور دیا
سحر آئیں تو وہ منظر کہ جو دیکھا میں نے — شاخ پر غنچے چٹکنے کی صدا اور دیا

لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا ہے تصور میں حسن
ہم رکاب آئے مرے گھر میں ہوا اور دیا

اور حسن عسکری کاظمی کے بعد ہیں نسیم سحر جو نسیم سحر کی طرح تازگی بھرے شعروں کی خوشبو سے مشامِ جاں کو معطر کر رہے ہیں۔ جناب نسیم سحر کی ایک منفرد خوبی یہ ہے کہ جس زمین میں بھی وہ شعر کہتے ہیں اس زمین کی زرخیزی سے کما حقہ پورا پورا لطف شعر کشید کر لیتے ہیں۔ بحر کی اور شاعر کے لیے شاذ و نادر ہی ممکن ہوتا ہے کہ اس زمین میں قدم بہ قدم رکھے۔ ان کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

خود اپنے ہی جادو میں گرفتار ہے کیسی!
کیا کہیے کہ وہ چشمِ فسوں کار ہے کیسی

سناٹا مسلط بھی ہے اس شہر پہ کیسا!
پلکیں بھی نگر کچھ نہیں دیوار ہے کیسی

نفرت کے سمندر میں جزیرے کی طلب ہے
مت پوچھو، محبت مجھے درکار ہے کیسی

یہ دل پہ غمِ ہجر کی ہر لمحے کی یورش
یہ پھول پہ چلتی ہوئی تلوار ہے کیسی!

قیدی کوئی گزرا ہے کہ برپا ہے کوئی جشن
کانوں میں یہ زنجیروں کی جھنکار ہے کیسی

سارے شعر تیوروں سے بھرپور ہیں۔ سبحان اللہ

اور اب آگے غزلوں کے انبار میں شعروں کے جو اکا دکا ہیرے چھپے ہوئے ہیں وہ نذرِ قارئین کرتا ہوں۔

پرندے کوچ کرتے جا رہے ہیں
ہمارے گھر اجڑتے جا رہے ہیں
اوریا مقبول جان

کھوٹے سکے کی طرح کر دیا اس نے واپس
تھی غلط فہمی ہماری کہ کھرے ہیں ہم بھی
راحت سرحدی

اجلی سی کھلتی ہوئی آئی میرے تکیے پہ
کبھی تو خیر خبر خواہ لیتے ہیں
خاور اعجاز

اک قیامت گزر گئی ہم پر
آپ کہتے ہیں کچھ ہوا ہی نہیں
سید قاسم جلال

لوٹا بھی مجھے تم نے، تو مجرم بھی مجھے ٹھہرا
جاگیر تمھاری میں ہے، قانون تمھارا
سید ضیا حسین

جہانِ رنگ و بو میں جی رہا ہوں
تمھاری آرزو میں جی رہا ہوں
شوکت محمود شوکت

اپنی حاجت کو سامنے رکھ کر
اپنا اپنا خدا بناتے ہیں
منظور ثاقب

روگ بیلے صدائیں پھولوں کی
سن رہا ہوں ابھی اداس غزل
ممتاز راشد لاہوری

کیسے کیسے حسین چہرے ہیں
کوزہ گر کا کمال دیکھتے ہیں
احمد عقیل

ہاتھ پانی میں جو ڈالے تو غضب ڈھانے لگے
اور بھی کھلنے لگا، رنگِ حنا، پانی میں
اکرم ناصر

اک دربدری ہے، مرا گھر کوئی نہیں ہے
ہاں ہاں یہ سبھی اپنے ہیں، پر کوئی نہیں ہے
شبہ طراز

میں تیرا جسم مہکانے میں تھوڑا وقت لوں گا
مجھے شاخِ دلِ برباد سے توڑا گیا ہے
کبیر اطہر

سمٹ کے رہتا ہوں جو افسردہ خیالوں میں کہیں
اپنے اندر ہی کسی جنگ سے ہارا ہوا میں
شکیل احمد خان

اپنے میرے بیچ کنول
ایک نشانی رہنے دے
آمنہ تحریم کنول

اس کے سوا دل میں کوئی آرزو نہیں
قربت نہیں تو دولتِ خواب و خیال دے
شمیم سید

گلاب کھلا ہوا اور دل کھلا ہوا
تمھارے حسن کی اب کیا میں دوں مثال کہیں
مسعود چوہان

نسیم سحر

برادرم عمران منظور۔ سلام مسنون۔ جنوری ۲۰۲۱ء کا شمارہ خلاف معمول چار جنوری کو ملا، ورنہ جس طرح بعض لوگوں کی عین وقت پر آمد کے سبب گھڑیوں کا وقت ٹھیک کر لیا جاتا تھا، اسی طرح 'بیاض' کی آمد سے ہمیں تاریخ کی آمد کا پتہ چلتا ہے کہ اب تنخواہ ہو یا پنشن اس کی وصولی کے لیے پہلی تاریخ کو جانا نہیں پڑتا۔

اس مرتبہ خط میں 'بیاض' کی منظومات کے پسندیدہ اشعار لکھنے پر ہی اکتفا کروں گا کہ افسانوں اور مضامین پر تبصرہ وقت مانگتا ہے اگرچہ ان تمام کا مطالعہ بھی کر چکا ہوں لیکن اس مرتبہ یہ میدان اور خطوط کی گنجائش دوسروں کے لیے چھوڑ رہا ہوں:

میں تغزل میں بھروں یاد مدینہ کی کسک
یہ غزل میری غزالاں ہے مجھے نعت سے
آصف ثاقب

کیسے بجھا سکے گی چراغ محمدی
فانوس بنتے دیکھے ہیں میں نے ہوا کے ہاتھ
عقیل رحمانی

ایک نعت ایسی بھی ہے جو ابھی لکھی تو نہیں
لیکن اشکوں سے انھیں میں نے سنائی ہوئی ہے
سرور حسین نقشبندی

سب انبیا کرام کا لازم ہے احترام
لیکن مرے نبی پہ امامت تمام شد
صغیر احمد صغیر

گونج اک نغمے کی ہے مُعبر تنہائی بھی
کتنی قوسیں کہ کھلی ہیں تری قوسوں سے

ڈھونڈ ویران حویلی کے دریچوں میں انھیں
پوچھ لوٹے ہوئے نقش کا پتہ جھونکوں سے
خالد احمد (مرحوم)

کسی دشمن سے ہم تسخیر ہونے کے نہیں ہیں
ہمیں اپنی ہی صفوں کے منافق و جعفر کا ڈر ہے
جلیل عالی

بہت کھیلا ہوں مل کر موجۂ سیلِ رواں سے میں
بچی میں ڈوبنے سے پیشتر تیراک ہوتا تھا
منظور صدیقی زرکی

مکانی لامکانی ہو گئی ہے
سبھی منظر بدلتے جا رہے ہیں
اوریا مقبول جان

کھوٹے سکے کی طرح کر دیا واپس اس نے
تھی غلط فہمی ہماری کہ کھرے ہیں ہم بھی
راشد مرحدی

مقید ماضی و امروز میں تھا
غبارِ راہِ فردا ہو گیا ہوں
رشید آفرین

ملی تو ہے دلیلِ فتح یابی
کہ میں قلبِ عدو میں جی رہا ہوں
شوکت محمود شوکت

تجھے اے خوش بدن دشمن تجھی، میں لطف دوں گا
مجھے کیکر نہیں شمشاد سے توڑا گیا ہے
نصیر الظہیر

ہم کو کسی بھی شے کی ذرا بھی کمی نہ ہو
جتنا بھی دے خدا، ہمیں رزقِ حلال دے
شمیمہ سید

گرا گرا کے اسے بار تھک چکا ہوں میں
وہ جو دبا ہے مرے عشق میں تھک، دیکھو
آفتاب خان

تیری آواز جو سنتا ہوں تو سرِ دشت ہوں
تجرکرتا ہے بابت تجھ مرادی مجھ میں
اشرف کمال

چاہتے دل کو لوگ دکھاتے ہیں
آپ کرتے ہیں سوختات کا دکھ
ارشد محمود ارشد

بات کرنے میں کیا برائی ہے
خودکشی مسئلے کا حل تو نہیں
وسیم عباس

جس طرح مڑ کر رہے ہو تم زمیں
آ گئے گا آسماں دیوار سے
محمد ادریس راجا

پچھلی صف میں بھی نظر آنے لگا
شاعری میں اب عیاں ہونے سے میں
اسحاق وردگ

ازہر منیر

جناب عمران منظور صاحب! سلام مسنون!

معلوم نہیں محمد ارشاد صاحب کو یہ فہم کیوں ہوا کہ میں نے اُن پر پنجاب کے خلاف سازش کرنے کا الزام لگایا ہے۔ میں نے لکھا تھا: "حیرت ہے ان جیسے لسانیات کے حوالے سے اچھا خاصا باخبر شخص نے یہ بات تحریر کی ہے اور نہیں جانتے کہ پنجابی کو تقسیم کرنے کی اس سازش کی بنیاد جارج اے گریرسن نے اپنی کتاب Linguistic Survey of India میں کوئی سو برس پہلے رکھی تھی اور اس سازش کو عملی جامہ 1962 میں پہنایا گیا تھا۔" بصد احترام اس میں کسی طور اس پر سازش کا الزام نہیں ہے۔ پنجابی کے ٹکڑے کرنے کی سازش تو گریرسن نے رکھ دی تھی اور 1962 میں یہ سازش مکمل بھی ہو گئی تھی۔ اب محمد ارشاد صاحب یا کسی اور نے سازش کیا کرنی؟

میں نے لکھا تھا کہ چونکہ یہ بات تفصیل چاہتی ہے اس لیے اس حوالے سے الگ مضمون تحریر کروں گا۔ لیکن یہ مضمون طوالت کا متقاضی ہے۔ کئی قسطوں میں چھپے گا۔ تو اگر آپ اسے شائع کرنے کو تیار ہوں تو دیگر مصروفیت کو ترک کر کے لکھ دیتا ہوں۔ کہیے کیا حکم ہے؟

بہر حال محمد ارشاد صاحب نے میرے لکھے کو غالباً قدرے سرسری انداز میں دیکھا اور اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ میں نے اُن پر پنجاب کے خلاف سازش کا الزام لگایا ہے اور پھر اس پر وضاحتی مضمون تحریر کر دیا۔ مجھے اس بات پہ افسوس بھی ہو رہا ہے اور حیرت بھی۔ اس لیے کہ میں نے اُن پر ایسا کوئی الزام نہیں لگایا۔ میری تربیت ہی ایسی ہوئی ہے کہ خود سے بڑوں کیا، چھوٹوں کی بھی توہین کرنے یا اُن کا دل دکھانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ دل دکھانا میرے مسلک میں شامل نہیں۔ میں اس حوالے سے پنجابی کے عظیم شاعر میاں محمد بخش کا پیروکار ہوں جو کہتے ہیں:

مسجد ڈھا دے، مندر ڈھا دے، ڈھا دے جو کجھ ڈھیندا   اِک کسے دا دل نہ ڈھاویں، رب دلاں وچ رہندا

یا بقول شیخ سعدی:

دل بدست آور کہ حج اکبر است   از ہزاران کعبہ یک دل بہتر است

علم طنطنہ اور طیش نہیں، عجز اور حلم سکھاتا ہے۔ جس میں عجز اور حلم نہیں، اُس میں علم بھی نہیں۔ جس میں طنطنہ ہے، جلد طیش میں آ جاتا ہے اُس کے پاس علم نہیں، محض معلومات ہیں جنھیں وہ غلطی سے علم سمجھ بیٹھا ہے۔ جبکہ کئی تو اپنی بات منوانے کی خاطر ذاتیات اور جھگڑے پہ اُتر آتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے اُن کا تصور حق تک رسائی نہیں، اپنی انا کی تسکین ہوتی ہے۔ یہ باتیں ہمیشہ میرے پیش نظر رہتی ہیں۔

وسیب پنجاب کی اصطلاح میری وضع کردہ نہیں، نہ ہی اس کا کسی نام نہاد گریٹر پنجاب سے کوئی تعلق ہے۔ یہ اصطلاح صدیوں سے استعمال ہو رہی ہے۔ پنجابی لوک گیتوں میں تو اس کا ذکر ہے ہی، بہاول پور سے تعلق رکھنے والے پنجابی کے محترم شاعر مولوی لطف علی بہاول پوری نے کوئی صدی بھر پہلے کہا تھا:

سوہنے دیس پنجاب اتے ہے ہتھ تن پاک دا سایہ

جبکہ خواجہ غلام فرید نے اسے ملک پنجاب کا نام دیا ہے۔ چنانچہ مہاراں شریف (بہاول پور) کے صوفی بزرگ خواجہ نور محمد مہاروی کی شان میں لکھی کافی میں خواجہ صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

عرب دل ماہی دی عجم وی ماہی دی ملک پنجاب دا راجہ

ملک پنجاب اور وسیب پنجاب صوبہ پنجاب سے مختلف، وسیع تر اور درست تر اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ہے، وہ تمام علاقہ جو انتظامی اور سیاسی بنیادوں پر وجود میں آنے والے چاہے کسی بھی صوبے یا ریاست میں واقع ہو مگر اس کا وسیب (کلچر)، تہذیب اور زبان پنجابی (اس کی درجنوں بولیوں میں سے کوئی بولی) ہو۔ ریاستیں اور صوبے تو سیاسی اور انتظامی بنیادوں پر بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ وسیب پنجاب کا جنوبی علاقہ جب سندھی راجہ داہر کی عملداری میں تھا تو اس دوران یہ وسطی، شرقی اور شمالی پنجاب سے کٹا رہا۔ اسی طرح غیر پنجابی حکمران جب پورا وسیب پنجاب اُن کے زیر اقتدار تھا تو اس کی شناخت کو مٹانے کی خاطر اسے صوبہ

لاہور" اور "صوبہ ملتان" میں تقسیم کرتے رہے اور خصوصاً ملتان میں شفیع جیسے غیر پنجابی علاقے شامل کر کے اس کی پنجابی شناخت کو ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے تاہم وہ اپنے اس مذموم مقصد کے حصول میں کامیاب نہ ہو پائے اور خواجہ غلام فرید کا ملک پنجاب اور مولوی لطف علی بہاول پوری کا دیس پنجاب ہمیشہ ملک پنجاب اور دیس پنجاب ہی رہا اور آج بھی ہے۔ تقسیم کے وقت قائد اعظمؒ نے اسے متحد رکھنے کی انتہائی کوشش کی اور اس کے متحد رہنے کے حق میں ناقابل تردید دلائل بھی دیے لیکن ان کی بات تسلیم نہیں کی گئی۔ نتیجہ یہ کہ آج یہ پاکستان اور ہندوستان کے کتنے ہی صوبوں اور ریاستوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ تاہم یہ بیان کرنے سے مقصود ان علاقوں کو پھر سے متحد کرنا یا موجودہ علاقوں کو ماضی کی طرح پھر سے مختلف صوبوں میں تقسیم کرنا نہیں فقط یہ بتانا مقصود تھا کہ مولوی لطف علی بہاول پوری کے دیس پنجاب اور خواجہ غلام فرید کے ملک پنجاب سے کیا مراد ہے اور اس کا اطلاق کن کن علاقوں پر ہوتا ہے اور ماضی میں ہوتا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وقت وہ تھا جب برصغیر کو آزادی ملی اور قائد اعظمؒ نے اس وقت اسے متحد رکھنے کی انتہائی کوشش کی۔ اب وہ وقت گزر چکا۔ اب پنجاب کے یہ دو حصے دو مختلف ممالک کا حصہ ہیں اور اسی طور رہیں گے۔

خواجہ غلام فرید نے خواجہ نور محمد مہاروی کی زبان کے بارے میں اپنے ملفوظات کے مجموعے جس کا اردو ترجمہ "مقابیس المجالس" کے نام سے ہوا ہے، میں بیان کیا ہے کہ:

"آپ اکثر وہ پنجابی زبان بولتے تھے جو علاقہ مہاران شریف میں بولی جاتی تھی۔" (خواجہ غلام فرید۔ مقابیس المجالس۔ مقبوس 22۔ جلد چہارم)

یعنی پنجابی زبان کی وہ بولی جو مہاران شریف (بہاول پور) کے علاقے میں بولی جاتی ہے اور جسے عرف عام میں ریاستی بولی کہا جاتا ہے۔ جبکہ غلام فرید کے کلام کو پہلی بار مرتب کرنے اور اس کا اردو ترجمہ کرنے والے مولوی عزیز الرحمٰن عزیز بہاول پوری کا بہاول پور میں بولی جانے والی زبان کے بارے میں کہنا ہے کہ:

"یہاں کی عام زبان ملتانی ہے جو پنجابی زبان کی ایک شاخ ہے۔" (مولوی عزیز الرحمٰن عزیز بہاول پوری۔ صبح صادق طبع اول 1900) تفصیل الگ مضمون سے پیش کی جائے گی۔

امید ہے آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔ تمام تر عجز و انکسار کے ساتھ۔

نور کمال شاہ

محترم عمران منظور صاحب السلام علیکم!

ماہ جنوری کا بیاض حسب معمول 4 تاریخ کو ملا۔ چند ساعتیں تو رسالے کے نقش و نگار اور حسین مندرجات دیکھتا رہا۔ خوبصورت سرورق، صاف و شفاف سفید بے داغ کاغذ اور مندرجات کی دلفریب پیشکش 'بیاض' کے قد کاٹھ میں اضافہ کر رہی ہے۔ 'بیاض' کی خوش نصیبی یہ ہے کہ اگر ایک طرف اسے پر خلوص اور محنتی ایڈیٹر ہاتھ آیا ہے تو دوسری طرف فعال دستہ بھی اسے ملا ہوا ہے جو مہینوں کا کام دنوں میں کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب ہی تو یہ پرچہ صرف ہر مہینے کے آخر تک تیار ملتا ہے بلکہ اگلے دو تین دنوں میں پورے پاکستان میں اس کی ترسیل بھی مکمل ہو جاتی ہے۔ ساتھ ساتھ اردو ادب کے چیدہ چیدہ ادیب و لکھاری بھی اس کے حصے میں آ چکے ہیں۔ جن کی تحریروں سے پرچہ مزین ہو کر ممتاز ادبی شناخت کا حامل بن جاتا ہے۔ امجد اسلام امجد، آصف ثاقب، نسیم سحر، حسن عسکری کاظمی، جلیل عالی کے ساتھ ساتھ کئی اور بڑے بڑے ادیب اور لکھاری بیاض کی رونق بڑھا رہے ہیں۔

موجودہ شمارے میں حمد اور نعت کے پرعقیدت نذرانے کے بعد "حاصل اور محرومی" کے عنوان سے سلیمان عبداللہ زار کا مضمون تصوف شامل ہے۔ افسانوں کے ذیل میں نو افسانے، ایک انگریزی فکشن اور ایک ترجمہ شدہ افسانہ شامل ہے۔ بلقیس ریاض، انعام الحسن کاشمیری، رضوانہ روحی، انجم جاوید اور پروفیسر بخت شاہ قاضی کے افسانے اچھے ہیں۔

ہمیشہ کی طرح غزلیات کا حصہ نہایت جاندار اور شاندار ہے اور خوبصورت غزلوں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ مضامین کے حصے

میں محمد ارشاد کا مضمون "مسیحا" ... شامل ہے جس میں سرائیکی زبان کے متعلق ازہر منیر کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی کے فن اور شخصیت پر سلمیٰ اعوان کا مضمون خوب ہے۔ نظم کے حصے میں بھی اس دفعہ خوبصورت نظمیں شامل ہیں۔ شوکت علی شاہ صاحب کی شاہ داستان اور وجاہت تبسم کے ناصر کاظمی کی شاعری کا عروضی تجزیہ کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ دونوں اچھی اور خوبصورت تحریریں ہیں۔ اسی طرح اسلام عظمی کی تحریر "پارسے شاہ داستان" اور محمد حنیف کا "آنگن" پر ایک نظر اچھی تحریریں ہیں۔ وردہ نوشین خان اور فرخندہ شمیم نے میرے افسانے کا ذکر کیا ہے ان کا بے حد مشکور ہوں۔

ادارے نے انقلابی قدم اٹھاتے ہوئے "بیاض" کو رواں مہینے سے آن لائن بھی پیش کر دیا ہے جو کہ ایک مثبت اور تعمیری اقدام ہے۔ بہت سے ادب دوست ساتھی اب با آسانی بیاض تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ پرچے کے آخر میں خطوط کا تنقیدی اور تعمیری سلسلہ شامل ہے جس میں گزشتہ شمارے پر قارئین کی آرا پیش کی گئی ہیں۔ "بیاض" کی بلندی سے بلند تر پرواز سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بہت جلد یہ صف اول کے ادبی شماروں میں شامل ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ۔

رانا محمد شاہد

عمران منظور صاحب، اعجاز رضوی صاحب! السلام علیکم!

جنوری کا سرورق موضوع شمل تھا کہ انسان کے لیے دعا کے ساتھ ساتھ کوشش و عمل بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ "اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے، جس کی وہ کوشش کرتا ہے"

تو کامیابی کے لیے کوشش و عمل کی اہمیت دعا سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ انسان اللہ کی واحد مخلوق ہے۔ جسے ارادے اور فیصلے کی قوت دی گئی۔ اسی قوت کی بدولت انسان چاند پر چلا گیا اور خود کو ہوا میں اڑانے کے قابل بنا لیا۔ دنیا میں بے شمار انسان ہیں۔ جنھیں مصائب و مشکلات پیش آئیں۔ مگر کوشش اور ارادے کی پختگی نے انھیں کامیاب انسان بنا دیا۔ تعلیم نہ ہونے کے باوجود بل گیٹس بزنس میں بن گیا اور سکول نہ جانے کے باوجود نیوٹن سائنس دان بن گیا۔

روحانی موضوع پر سلیمان عبداللہ دار کی "حاصل اور محرومی" زبردست تحریر تھی۔ آسودگی بہت بڑی نعمت ہے اور یہ راضی بہ رضا رہے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ حاصل پر مطمئن رہنا ہی آپ کو رب کے قریب کرے گا۔ کیونکہ حقیقت تو یہی ہے کہ "اس دنیا کو بہر حال کسی نہ کسی روز چھوڑنا تو ہے ہی۔ پھر اسے چھوڑنا یعنی مرنے سے پہلے مرنا آسان ہو جائے گا۔" یہ بات اگر ہمارے پیش نظر رہے تو بہت سے مسائل حل ہو جائیں کہ ضرورت تو ایک فقیر کی بھی پوری ہو جاتی ہے اور خواہشات بادشاہ کی بھی پوری نہیں ہوتیں۔

انعام الحسن کاشمیری کا افسانہ "اصل گھر" دنیا کی حقیقت کو بخوبی آشکار کر رہا تھا۔ انسان دنیا میں جتنی بھی دولت اکٹھی کر لے اور جتنے مرضی محلات بنا لے۔ نہ دولت کام آتی ہے اور نہ لوگ قبر پر زیادہ دیر ٹھہرتے ہیں۔ انسان عارضی دنیا اکٹھی کرنے کے خسارے کا سودا کرتا ہے اور یوں "اصل گھر" کو بھلا دیتا ہے۔ سید ارشاد حسین نے بوڑھے لوگوں کے ساتھ، بڑے لوگوں کے ساتھ روپے کو "انصاف کا ترازو" میں تولنے کی بھرپور کوشش کی۔ منفرد انداز بیان کے ساتھ افسانہ اچھا لگا۔ نیلم احمد بشیر اور روما نہ روحی کے افسانے بھی دل کو چھو لینے والے تھے۔ کرن اجالا کا حالات حاضرہ پر لکھا افسانہ بھی خوب تھا۔

سلمیٰ اعوان کا ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی پر لکھا گیا مضمون بہت اچھا لگا۔ ڈاکٹر صاحب سے میں بھی دو بار مل چکا ہوں۔ سلمیٰ صاحب نے ان کی شخصیت کے حوالے سے دلچسپ باتیں لکھیں۔ خاص طور پر یہ کہ ڈاکٹر صاحب کی دوسری بیوی ان کی انگریزی اور ہسٹری میں کلاس فیلو تھیں۔

"نظریاتی طور پر آپ ان سے کتنا بھی اختلاف کریں۔ سازشوں سے تعاون کرنے اور فائدے اٹھانے کا الزام لگائیں۔ مگر یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ انھوں نے صحافت کو دیا رنگ و حسن دیا۔ ان کے ہاں فکری طور پر ایک نسل کی تربیت ہوئی۔" ان کی یہ باتیں حقیقت ہیں کہ آج کی صحافت کے بڑے نام اردو ڈائجسٹ کے ہی تربیت یافتہ ہیں اور نئے لکھنے والوں کی جس طرح ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی نے حوصلہ افزائی کی۔ ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔

محمد ارشاد اور وجاہت تبسم نے بھی اچھا لکھا اور دانشہ تحسین خان کا تبصرہ بھی دلچسپ تھا۔ کچھ غزلوں کے یہ اشعار پسند آئے:

ان گنت دکھ میرا اک چپ میں سمٹ آئیں گے   لوگ اندازے لگائیں گے نری باتوں سے
ڈھونڈ ویران حویلی کے دریچوں میں انھیں   پوچھ ٹوٹے ہوئے پتوں کا پتہ جھونکوں سے

خالد احمد

ہم سفر تھے بھی اور نہیں بھی تھے   ہم عجب فاصلے سے ساتھ چلے
ایک منزل تھی یوں تو دونوں کی   تم کسی، ہم کسی کے ساتھ چلے

امجد اسلام امجد

شجر سے کٹ کے راستے میں پڑا ہوا ہجر موسم سے   میں اس سے پیشتر اس حسن کی املاک ہوتا تھا
نکل کر دشت سے آبادیوں کی نظر ہونے تک   میں جیسا تھا مگر آلائشوں سے پاک ہوتا تھا

منظور صدیقی رضی

امجد اسلام امجد کی نظم "زندگی میں ریاضی کا پرچہ بھی" بھی بہت پسند آئی:

امتحان کا مگر ہے عجب سلسلہ / مسئلہ کچھ بھی کہیں ایک جیسا نہیں / سب کے پرچے الگ / سب کے مضمون جدا
نقل سے بھی یہاں کام چلتا نہیں / اور یہ بھی ستم / ان کے حل کے لیے / ایک سا وقت بھی سب کو ملتا نہیں

محمد آفتاب تابش

محترم جناب عمران منظور صاحب! السلام علیکم!

سالِ نو کی مبارکباد قبول فرمایئے۔ گزشتہ روز "ریاض" موصول ہوا، فوراً ہی پڑھنے بیٹھ گیا اور پڑھتا ہی چلا گیا، وقت کا احساس ہی نہ ہو سکا۔ اس بار کے شمارے میں نجانے کیا بات تھی کہ اس کے سحر سے نکلنا ممکن نہ ہو سکا۔ "سلیمان عبداللہ ڈار" صاحب کے مضمون "حاصل اور محرومی" کی جتنی داد دی جائے، کم ہے۔ میں نے مذکورہ مضمون کو تین بار پڑھا ہے اور ہر بار ناقابلِ بیان سرور پایا۔ اپنی پسندیدہ شخصیت جناب "اوریا مقبول جان" کی غزل پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی ان کا کلام پڑھنے کو ملتا رہے گا۔ اس کے علاوہ درج ذیل اشعار لاجواب تھے:

خاک کے بنانے والوں کا انجام خاک ہے
آقا کی پشت پر ہیں سدا کبریا کے ہاتھ

عقیل رحمانی

ایک نعت ایسی بھی ہے جو ابھی لکھی تو نہیں
جن انگشتوں سے انھیں میں نے سنائی ہوئی ہے

سرور حسین نقشبندی

پیارے آقا پہ ہوئی ختم نبوت کیفی
اب نبی ایا میں کوئی نہیں آنے والا

محمود کیفی

دھوپ ایسی ہے کہ کیا کہیں امجد
اپنا سایا نہ اپنے ساتھ چلے

امجد اسلام امجد

جیسے جیسے بڑھی بے نیازی تری
اپنے شکوے گلے مختصر ہو گئے

شاہین مفتی

کوئی لکھے گا کیا تو ہوا
ابھی جاں سے گزرتے جا رہے ہیں

اوریا مقبول جان

یہی تو ہے دلیل صبح یابی
کہ میں قلب عدو میں جی رہا ہوں

خاورت محمود شوکت

پھر کوئی ڈوب گیا کچا گھڑا پانی میں
تیرگی بیٹھی کی ایک ردا پانی میں

اکرم ناصر

دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ اور آپ کی ٹیم کو اپنی امان میں رکھے اور آپ یونہی "ادب" کی خدمت کرتے رہیں۔ ایک تازہ غزل ارسالِ خدمت ہے، قریبی شمارے میں شائع کر کے ممنون فرمایئے گا۔ تمام کارکنان "ریاض" کو سلام!

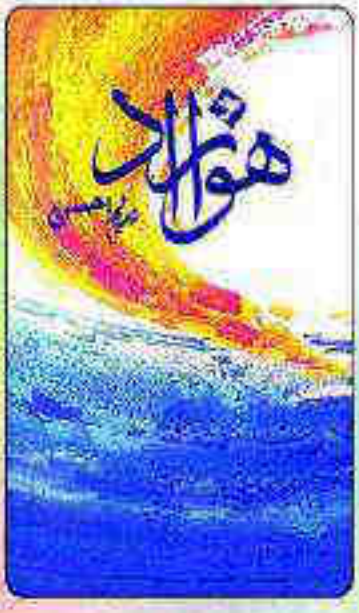

اے رسولِ امیں!

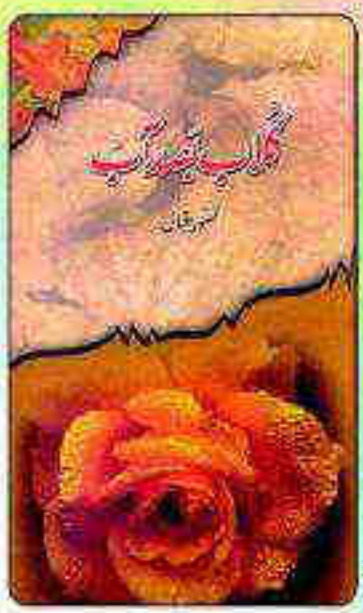

AKG CANADA

VISA IMMIGRATION SERVICES

We are a Canadian based licensed immigration practicing firm, providing customized solutions and advise on matters related to Canadian Immigration

HERE'S WHAT WE OFFER:-

- Express Entry
- Permanent Residence
- Provincial Nominee Program
- Family class sponsorship
- Visitor Visa
- Student Visa
- Business Investor Immigration
- Immigration Refugee

www.akgcanada.com info@akgcanada.com +1-647-617-0888